سوالیہ نشان

شیخ محمد اقبال



سوالیہ نشان

(دُوسرا ایڈیشن)

از

پروفیسر شیخ محمدؐ اقبال

ایم۔ اے انگلش ، ایم۔ اے اُردو

ایسوسی ایٹ پروفیسر گورنمنٹ کالج سرگودھا

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں۔

بار اوّل ——— ۱۹۸۹ء

بار دوم ——— ۱۹۹۳ء

تعداد ——— ایک ہزار

طابع ——— ثنائی پریس سرگودھا

قیمت ——— ۱۰۰۔۰۰ روپے

خطاطی ——— منوّر احمد خوشنویس منوّر قلم سرگودھا

ملنے کا پتہ ——— بزمِ فکر و خیال
رحمت پارک کالج روڈ سرگودھا



شائع شدہ شعری مجموعہ ——— ساحلِ تشنہ لب

اِنتساب

اُن سوالوں کے نام
جن کا کوئی جواب نہیں

ے ہر ایک حرف سے پُوچھا ہر ایک نُقطے سے
مرا سوال مگر تشنۂ جواب رہا

اظہارِ تشکّر

سچ پوچھیئے تو سب سے پہلے تو میں شکر گذار ہوں اُن واقعات و حادثات کا جنہوں نے میرے اندر کے زندہ تر انسان کو متاعِ لوح و قلم عطا کی اور اُسے قدرے طویل تر زندگی کا واہمہ عطا کر دیا۔ بعدازاں میں سپاس گذار ہوں جناب ڈاکٹر انور سدید صاحب کا کہ انہوں نے کمالِ محبّت سے میرے شعری مجمُوعے کا دیباچہ رقم کیا۔ اور جناب عاصی کرنالی صاحب، ڈاکٹر خورشید رضوی صاحب کا جنہوں نے مجھے اپنے گرانقدر مشوروں سے نوازا اور میری حقیر کاوش پر اپنی آراء رقم کیں۔ میں شکر گذار ہوں جناب مرحوم رئیس امروہی صاحب جناب پریشان خٹک صاحب اور ڈاکٹر رفیع الدّین ہاشمی صاحب کا جنہوں نے فلیپس تحریر فرما کر میرے حرفوں کو پذیرائی عطا کی۔ علاوہ ازیں میں ممنون ہوں جناب چوہدری محمد اکبر، پروفیسر ریاض احمد شادؔ اور پروفیسر علی حسنین شیفتہ کا۔ اور بالخصوص اپنے بزمِ فکر و خیال کے احباب کا جنہوں نے قدم قدم پر میری مُعاونت کی اور یہ مجمُوعہ کلام اشاعت پذیر ہوا۔ ان میں شامل ہیں۔ اشرف شاہین۔ رانا محمد اقبال نسیم الغنی۔ نائلہ رفیع۔ ہارُون الرشید ساجد۔ ریاض احمد گھُمن۔ جاوید اقبال ناصر۔ ابراہیم گوہر۔ محمد مظہر۔ شاہد اسلام دانش۔ ایم۔ ڈی شادؔ۔ محمد اسحٰق کُنڈ اور عمانوئیل نذیر۔ خوبصورت ٹائٹل بنانے پر میں شکر گذار ہوں مُلک کے ممتاز مصوّر جناب اسلم کمال صاحب کا اور کاتب جناب منوّر قلم کا۔

پروفیسر شیخ محمد اقبال

129/131۔ رحمت پارک کالج روڈ سرگودھا

فون نمبر: 65950 — 66180

ڈاکٹر انور سدید

دیباچہ

دیدۂ بینا کا شاعر ـــــ پروفیسر شیخ محمّد اقبال

پروفیسر شیخ محمد اقبال نے اپنی شاعری کی دوسری کتاب کا نام "سوالیہ نشان" اپنے اس شعر سے اخذ کیا ہے۔

ہر ایک حرف سے پُوچھا، ہر ایک نُقطے سے
مرا سوال مگر تشنۂ جواب رہا

اس شعر سے ہی مجھے خیال پیدا ہوا کہ پروفیسر شیخ محمّد اقبال صاحب اس کتاب میں سماجی حقیقت کو نسبتاً زیادہ اہمیّت دیں گے اور ہمارے سامنے حقیقت کو نہ صرف ایک بڑے سوالیہ نشان کی صُورت میں پیش کردیں گے بلکہ یہ توقع بھی کریں گے کہ ہم ان کے اٹھائے ہوئے سوال کا جواب بھی انہیں فراہم کریں۔ مجھے اُن کی شاعری کے اعماق میں اُترنے کا موقعہ ملا تو حیرت ہوئی کہ انہوں نے اس کتاب میں سوال کی دُھند بکھیرنے کے بجائے "جواب" کا اُجالا پھیلانے کی کوشش کی ہے۔ "جواب" سے میری مُراد وہ تجربہ ہے جو اقبالؔ صاحب نے اپنے دیدۂ دل سے حاصل کیا۔ اور جس کی صداقت انہوں نے اپنی بصیرت سے پرکھی۔ چنانچہ "سوالیہ نشان" سے ان کی مُراد اگر لاینحل کائنات ہے تو مژدہ ہو کہ اقبالؔ صاحب نے اس کتاب میں اپنے تجرباتِ حیات کو اس بامعنی انداز میں پیش کیا

ہے کہ ان کا اظہار قلبِ انسانی کی واردات بن گیا ہے۔ ان کی تخلیق کردہ شعری کیفیت ہماری جانب یوں سفر کرتی ہے کہ تجربہ ہمیں خود اپنی ذات کے اعماق میں پہلے سے جاگزیں محسوس ہوتا ہے۔ پروفیسر اقبال صاحب نے اسے جادوئی چھڑی سے ہمارے لاشعور سے کریدا اور ہمارے شعور کی سطح پر اُبھار کر اس تجربے کی تجدید کر دی۔ چنانچہ اس کتاب کے سوالات کا رُخ اگرچہ شیخ محمد اقبال کی اپنی ذات کی طرف ہے۔ لیکن ان کا اظہار جب ابلاغ کی منزل طے کرتا ہے تو کائنات کے کسی اہم مسئلے کے حل کی طرف ہماری راہنمائی بھی کرتا ہے۔ خوبی کی بات یہ ہے کہ اقبال صاحب مسئلے کو دلیلوں اور مثالوں سے ثابت نہیں کرتے بلکہ اپنے تجربے کے حاصل کو سیّال حالت میں ہی رہنے دیتے ہیں اس کا ادراک حسی سطح پر کرتے ہیں اور آخر میں اسے شعر کے خوبصورت پیکر میں ڈھال دیتے ہیں۔ اقبال صاحب یہ تمام کام اس ژرف نگہی سے کرتے ہیں کہ ظاہر کی آنکھ نہ ہونے کے باوجود حقیقت ان کے سامنے پردہ پوش نہیں رہتی اور جمالِ فن اپنا باطن ان کے سامنے عریاں کر ڈالتا ہے۔

اس مقالے کے قارئین شاید جانتے ہوں گے کہ پروفیسر شیخ محمد اقبال حسِ باصرہ سے محروم ہیں۔ فطرت کی عطا یہ ہے کہ باصرہ کی یہ کمی نہ صرف بقیہ حواسِ اربعہ کی افزودگی کا باعث بنی بلکہ میرا خیال یہ ہے کہ اس کمی نے ہی ان پر داخلی بصیرت کا در کشادہ کر دیا اور ان کی چھٹی حس کو جسے ان کی پانچویں حس شمار کرنا چاہیئے، غیر معمولی طور پر بیدار کر دیا۔ اب صُورت یہ ہے کہ ہماری کم نگہی جن چیزوں تک رسائی حاصل نہیں کر سکتی وہاں پروفیسر شیخ محمد اقبال کی نگہہِ خارا شگاف آسانی سے پہنچ جاتی ہے اور اقبال صاحب وہ سب کچھ بھی دیکھ لیتے ہیں جو دیوار کی دوسری طرف پوشیدہ ہے۔ وہ ہمارے سامنے انسانی فطرت کا وہ نقش بھی ابھار دیتے ہیں جس میں ظاہر کی آنکھ کی منافقت بھرا مشاہدہ شامل نہیں ہوتا۔ لیکن بصیرت اپنی کارفرمائی

میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتی۔ چنانچہ شیخ محمد اقبال کی شاعری محض جذبات کا اظہار نہیں۔ بلکہ نظریّے کی تعبیر بن جاتی ہے کہ

"شاعری انسانی جذبات کی توسیع اور تخلیق کا باعث ہوتی ہے۔"

پروفیسر شیخ محمد اقبال کی شاعری کی ان چند نمایاں خصوصیات کے بعد اب مناسب معلوم ہوتا ہے کہ میں یہاں ان کے چند منتخب اشعار پیش کر کے اس تجربے میں شرکت کروں جو اقبال صاحب نے اپنی بصیرت سے حاصل کیا ہے اور جس میں غمِ ذات بھی ہے اور غمِ کائنات بھی۔

؎ دل کو تسکین دیتا رہتا ہوں ؛ مفلسی زندگی کا زیور ہے

؎ ہنر کی بات بنی اور نہ علم و دانش کی
جو تیر وقت نے چھوڑا، کبھی خطا نہ ہوا

؎ موت بے وجہ نہیں آئی ہے ؛ ہم نے جینے کی سزا پائی ہے

؎ لب پہ آئے تو جاں میں جاں آئے ؛ زندگی تیرا نام ہے شاید

؎ وہ بھیڑ تھی انساں پہ انسان گرا تھا ؛ ہر شہر جگر تھام کے حیران کھڑا تھا

؎ ہر اک آنکھ گڑی اس کے ہنستے ہونٹوں پر
کسی کو آنکھ مری بھیگتی دکھائی نہ دی

؎ اُٹھ اے صبحِ فردا، خود اپنی خبر لے
ہر اک محوِ کارِ جہاں، کس کو فرصت!

؎ آنکھ کے شہر میں بلا کا ہجوم ؛ دل کی بستی کے سارے گھر تنہا

؎ جہاں کے کام یوں تو سب کٹھن ہیں ؛ مگر در اصل مشکل سوچنا ہے

؎ ہمّت کی آنکھ دیکھ کے غمناک ہوگئی
منزل کے بعد اور کوئی راستہ نہ تھا

ؔ جس لمحہ ٹوٹی چھت مرے اپنے مکان کی
ایسے لگا کہ سر پہ مرے آسماں نہ تھا

پروفیسر شیخ محمد اقبال کی بصیرت بے حد روشن ہے وہ ایک ایسے دیدۂ ور نظر آتے ہیں جن کے منوّر باطن سے کرنیں پھوٹتی ہیں اور اشعار کی صورت اختیار کر لیتی ہیں۔ لیکن اس سب کے باوجود بصارت سے محرومی کا احساس شیخ محمد اقبال کی شاعری پر اس قدر غالب ہے کہ ان کے بہت سے شعری تلازمے اس احساس سے پھوٹتے ہیں. کئی مضامین نے اس احساس ہی سے جنم لیا ہے اور کئی نئے تخلیقی پیکر اس احساس کے زائیدہ ہیں۔ یہ چند اشعار ملاحظہ کیجیے۔

ؔ چل پڑتے ہیں اندازوں کی اُنگلی کو پکڑ کر
ہم آنکھ میں موجود نظر بھول گئے ہیں

ؔ اندھیری رات کی صُورت بڑی بھیانک تھی
اُجالے دیکھنے آتے تو ڈر گئے ہوتے

ؔ ہوائے تُند میں ہم بے چراغ ہی اچھّے
بُجھے چراغ تو کچھ اور تیرگی ہوگی

ؔ میں نے خُود ذوقِ نظر سے گھڑ لئے شمس و قمر
میرے روز و شب پہ پھیلا آسماں بیکار تھا

ؔ جو میں نے اس کو نہ دیکھا تو اس نے کب دیکھا
ہے زندگی بھی مری طرح بے بصر شاید

ؔ نوچ لی آنکھ سے کس نے دُنیا ٭ آسماں ہے نہ زمیں کچھ بھی نہیں

ؔ دل کے آگے راستے ہی راستے ٭ آنکھ کو کچھ بھی نظر آتا نہیں

شیخ محمد اقبال کی منفرد بات یہ ہے کہ انھوں نے اندھیروں سے مات

نہیں کھائی بلکہ ان لوگوں پر برتری حاصل کی ہے جو دہر کی اُجلی روشنیوں میں اندھوں جیسی زندگی گذار رہے ہیں۔ بصارت کی محرومی نے شیخ محمد اقبال کے ہاں بے بسی کا کرب پیدا نہیں کیا۔ وہ اطمینان کی دولتِ فراواں سے سرفراز ہیں اور درپیش حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے ہمہ وقت تیار رہتے ہیں۔ ان کی شاعری سے حوصلہ مندی ثابت قدمی اور مستقل مزاجی منعکس ہوتی ہے۔ زندگی گذارنے کی صحت منداور توانا روش سامنے آتی ہے۔ اور شیخ محمد اقبال اپنی غریبی اور غیوری کو اشتہار کی طرح جلی حروف میں لکھے بغیر اپنی انا کو تحفظ فراہم کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ وہ اندھیروں کو روشنی عطا کرتے ہیں۔ اُجالوں میں رہنے والے اندھے انسانوں کی راہنمائی کرتے ہیں، یہ فرض ادا کرتے ہوئے انہوں نے اپنی شخصیت کے منفرد گوشوں کو اس طرح آشکار کیا ہے کہ ان کی ذات کا آئینہ دکھائی دینے لگتا ہے۔

ے سُورج کے اُجالوں کو شبِ تار ہے درپیش
پھر بابِ کرم سے مجھے انکار ہے درپیش

ے ممکن ہو تو ہر دیدۂ بینا کو چُرا لے
پھر آنکھ کو اِک حُسن کا دیدار ہے درپیش

ے دن ڈھلا ہے تو ذرا آنکھ کو بینائی ملی
چاند تاروں سے بھلا بزم سجائیں کیسے

ے کِرن کِرن سے ٹپکتی ہیں وحشتیں شب کی
مرے نصیب کے محور میں ہے سحر شاید

ے معلُوم کسے کیسے ہوں اَب صبح کے تیور
ہم رات کو دانستہ گزرنے نہیں دیتے

زندگی اور شاعری کے یہ تیور مجھے بہت سے ایسے شاعروں کے

ہاں نظر نہیں آتے جنہوں نے اپنی بینائی کو تیز کرنے کے لئے آنکھوں پر عینکیں بھی چڑھا رکھی ہیں، اور شیخ محمدّ اقبال نے مجھے زندگی اور شاعری کے ان تیوروں سے آشنا کیا ہے تو میں ان سے اپنی ممنونیّت کا جتنا بھی اظہار کروں کم ہے۔

ڈاکٹر انور سدید
۲/۷، ستلج بلاک، اقبال ٹاؤن
لاہور

تاثرات

پروفیسر عاصی کرنالی

ساحلِ تشنہ لب سے سوالیہ نشان تک کا سفر

پروفیسر شیخ محمّد اقبال کا دُوسرا شعری مجموعہ **سوالیہ نشان** مطالعے سے گزرا۔ مَیں نے **ساحلِ تشنہ لب** کو بھی غور سے پڑھا تھا اور اُس پر اپنے تاثرات بھی لکھّے تھے جو اُس مجموعے میں شامل ہیں۔ دونوں کتابوں کے مطالعے کے سبب شاعر کے فکری سفر کے مختلف مراحل اور نشیب و فراز کی صُورتیں میرے ذہن میں محفوظ ہیں۔ اس لئے میں حسبِ توفیق آگاہی اور شناسائی سے پیدا ہونیوالے اعتماد کی بُنیاد پر گفتگو کر سکتا ہوں۔ شروع میں ایک بات ہو جائے جس کے کہنے کا محل یہی ہے۔ کسی نثری یا شعری تصنیف کا عنوان (اگر وہ ادیب یا شاعر ہی کے دل سے اُبھرا ہو) بسا اوقات اس کے نقطۂ نظر اور تصنیفی مواد ہی کا مظہر ہوتا ہے۔ عنوان میں اس کی ساری تخلیق کا تعارف اس طرح سمٹ کر آجاتا ہے جیسے آنکھ کے تِل میں آسمان۔ میرے نزدیک بعض عنوانات کتابوں کے الہامی ٹکڑے ہوتے ہیں۔ جو مُصنّف کے فکر و فن کی تجلیات کے پُوری طرح آئینہ دار اور اُس کے نقطۂ نظر اور مقاصد و مفاہم کے بھرپور عکّاس ہوتے ہیں۔ علّامہ اقبال کی تصانیف کے نام حوالے کے طور پر پیش کئے جا سکتے ہیں۔

پروفیسر شیخ محمد اقبال کی ہر دو شعری تصانیف کے نام بھی ایسے صحیح، دُرست اور موزوں و مناسب ہیں کہ ان سے بہتر اور مُناسب تر نام ممکن ہی نہیں۔ **ساحلِ تشنہ لب** میں ایک پیاس ہے جس نے پوری طرح

شاعر کے وجود کا احاطہ کر رکھا ہے۔ ایک ساحل، دریا یا سمندر سے کس قدر قریب ہے لیکن پانیوں کی یہ بہتات اُس تشنہ لبی کا مداوا نہیں ہے۔ ایک وہ شخص ہوتا ہے جو پیاسا ہے اور پانی اُس کی دسترس سے دُور ہے۔ دوسرا وہ ہے کہ پانیوں میں ڈوبا ہوا ہے اور پیاسا ہے۔ دونوں کے کرب کی مقدار اور شدّت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ ساحلِ تشنہ لب باطنی کرب کی ایک پُر اندوہ روداد ہے۔

اِس اوّلین مجموعے میں شاعر کی سوچ کا اسلوب یہ ہے کہ وہ یاس، محرومی، الم، ناکامی اور ناآسودگی کے حصار میں گھرا ہوا ہے لیکن اپنے تیشۂ عزم و اُمّید سے اِس حصار کی پتھریلی دیواروں پر ضربِ مسلسل لگا لگا کر انہیں توڑنا اور اس حصار سے باہر نکلنا چاہتا ہے۔ وہ شبِ تاریک میں صبحِ تابناک کا آرزومند اور دُکھ کی اذیّت ناک وادیوں سے منزلِ راحت و مسرّت کی جانب جادہ پیما ہے۔ باہر کی مہیب ظُلمتوں کے باوجود اُس نے اپنے دل میں ایک ننّھا سا دِیا روشن کر رکھا ہے اور چاہتا ہے کہ اس دِیئے کی لرزتی لَو ہی سے اِن ظُلمتوں کے خلاف جہاد کرے۔ الغرض **ساحلِ تشنہ لب**، اضطراب سے چل کر آسودگی کی طلب کا اور کرب کے مقام سے روانہ ہو کر مُسرّت کی تلاش کا سفر ہے۔ اس تمام سفر میں دبیز یاسیت کے باوجود اُس کے باطن کے اندر عزیمت و اُمّید کا ایک نوکیلا اور تیز خنجر متحرّک ہے جس سے وہ یاسیت کی تمام دبازتوں کو کاٹ کاٹ کر اور ریزہ ریزہ کر کے اُس فردوس کی تعمیر کرنا چاہتا ہے جس کا نقشہ اُس کے خواب و خیال میں مُرتّب ہو چکا ہے۔ مختصر یہ کہ ساحلِ تشنہ لب یاس سے آس کا سفر ہے۔

اَب آئیے **سوالیہ نشان** کی جانب:

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ آس سے یاس کی جانب سفر ہے۔ یعنی مراجعت کا سفر، یعنی اُمید سے نااُمیدی کا سفر، راحت طلبی سے اضطراب کا، منزلِ صبح سے وادئ شب کا، اثبات سے نفی کا، وجود سے عدم کا، کثیر القیمت اعداد سے صفر کا، یقین سے تشکیک کا، اور حاصل سے لاحاصلی کا سفر۔

اگر ایسا ہو تو گویا شاعر نے اپنی تمام تخلیقات کے صفحوں پر اور شعر و ادب کے صحیفوں پر سیاہی انڈیل دی۔ اپنی تمام تحریروں کو قلم زد کر دیا۔ اپنے تمام دفتروں کو چاک چاک کر دیا۔ مراجعت کا سفر اصل میں شکست اور پسپائی اور سپر اندازی کا عمل ہوتا ہے۔ تو کیا واقعی **سوالیہ نشان** مراجعت کا سفر ہے؟ یعنی ایک سوالیہ نشان میرے سامنے بھی ہے۔

بات یہ ہے کہ شاعر کا **سوالیہ نشان** اس کے سارے زخموں اور دُکھوں کا ایک علامتی اظہار ہے۔ وہ سوچتا ہے کہ اُس کی تخلیقی صلاحیتوں اور اُس کے شعری سرمایوں کا حاصل کیا نکلا۔

اُس جیسے ہزاروں اہلِ فکر اور اہلِ قلم کے افکار و اشعار نے کون سے مثبت نتائج مُرتّب کر لئے۔ تخلیق کار اپنی ہی آگ میں جلتے اور اپنی ہی اذیتوں میں سُلگتے رہتے ہیں، کڑھتے ہیں، تڑپتے ہیں۔ احساس کی دوزخ اور دردمندی کے عذاب میں مبتلا رہتے ہیں۔ یہ روگ انہیں کھا جاتا ہے، نگل جاتا ہے۔ اُن کے پھیپھڑوں میں سوراخ ہو جاتے ہیں، اُن کے خُون کا دباؤ بڑھتا ہے۔ وہ لہو بہاتے ہیں۔ خُون تھوکتے ہیں۔ وہ دل کی رگیں ٹوٹنے اور دماغ کی شریانیں پھٹنے سے مر جاتے ہیں۔ یہ سب کچھ ہو جاتا ہے لیکن مُعاشرے میں کوئی تغیر پیدا نہیں ہوتا۔ دُنیا میں کوئی ذہنی انقلاب نہیں آتا۔ وہی دولت و افلاس کا فرق، وہی جبر و مجبُوری، وہی حاکمی و محکومی، وہی شر کے پنجے میں گرفتار خیر، وہی منافقت

ہیں قید صداقتیں، وہی اسیرِ شب صبحیں، وہی زنجیری ظلمت روشنیاں، ہر طرف وہی شیطنت وہی ابلیسیت، وہی طاغوتیت! شاعر سوچتا ہے اتنی بہت سی سعادتوں، بشارتوں اور شہادتوں کا کیا بنا؟ اور پھر سوچ اس کا ساتھ چھوڑ دیتی ہے اور اس کا تمام ذہن، پورا دل اور سارا وجود ایک سوالیہ نشان بن جاتا ہے۔ ایک ایسا سوالیہ نشان جس کی نوک پر حال اور مستقبل دونوں معلّق ہیں۔

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ شعری مجموعے **سوالیہ نشان** میں ایسے اشعار کی تعداد کم سے کم ہے جو عزم و اُمّید کے مظہر ہو سکتے ہیں اور ان کا لہجہ بھی اُس سپہ سالار کا ہے جس نے سرنڈر کر دیا ہو، جس کے تمام ہتھیار چھین کر اُسے چاہِ زنداں میں دھکیل دیا گیا ہو، جو مر رہا ہو، جو آخری سانس لے رہا ہو اور جس کے ہونٹوں پر یہ آخری الفاظ لرزاں ہوں "میں جنگ ضرور جیتوں گا ـــــــ"

اسی طرح **سوالیہ نشان** میں یقین کی بجائے وہم، گمان اور تشکیک کی فضا زیادہ ہے۔ چند اشعار دیکھئے:

وہم بے چارگی ہے مختاری ٭ زلیست کا سارا سلسلہ مجبور

اِک سرابِ جسم و جاں تھا میں نہ تھا ٭ اِک مرا وہم و گماں تھا میں نہ تھا

کوئی شک ہے نہ یقیں کچھ بھی نہیں ٭ پاس اَب کچھ بھی نہیں کچھ بھی نہیں

اِک خلش سی ہے، لئے پھرتی ہے ٭ اے دلِ زار کہیں کچھ بھی نہیں

جانے کس وہم کی زد میں ہے کہ آج ٭ دل نہ شاداں نہ حزیں کچھ بھی نہیں

یہ ذہنی کیفیّت یعنی وہم، گمان اور تشکیک کی کیفیّت شاعر کے باطن کو اس طرح اپنی گرفت میں لے لیتی ہے کہ وہ ہر شے، ہر منظر اور ہر واقعے کو اسی اعتبار کی عینک سے دیکھتا ہے۔ ہر فرد، پورا مُعاشرہ، عصرِ رواں کا ہر لمحہ شاعر کو اسی توہّم اور اِسی بے یقینی کا ثبوت فراہم کرتا ہے۔ ایک فرد کی حیثیت

سے وہ اپنی ذات پر بھی نگاہِ تشکیک ڈالتا ہے تو کہتا ہے۔

ے میں دو حصّوں میں بٹتا جا رہا ہوں ٭ نظر کو دل، مرے دل کو نظر دے

ے میں کہ پھولوں سے زخم زخم ہوا ٭ اے خدائے بہار ایسا کیوں؟

ے جب آس بھی تنہا چھوڑ چلی ٭ جینے سے ہم نے توبہ کی

یہ کے یعنی اپنی ذات کو بے اعتباری اور تشکیک کی نظر سے دیکھنے کی لے اتنی بڑھ جاتی ہے کہ شاعر اپنے ہونے پر احتجاج کرتا ہے:

ے ہنسنا عذاب تھا کبھی رونا عذاب تھا ٭ سچ پوچھئے تو دوستو ہونا عذاب تھا

اپنی ذات کو معدوم و منسوخ کر لینے کے بعد شاعر دوسرے ہر فرد پہ نظر ڈالتا ہے۔

ے پس رہا ہے میانِ ارض و سما ٭ یہ فقط آدمی کی ہمّت ہے

تب تشکیک کی یہ لہر سارے معاشرے اور پورے عصرِ رواں کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے اور شاعر جس موضوع، جس جذبے اور جس خیال پر قلم اُٹھاتا ہے۔ تشکیک کی دُھند پھیلتی جاتی ہے۔

ے ہُنر کی بات بنی اور نہ علم و دانش کی ٭ جو تیر وقت نے چھوڑا کبھی خطا نہ ہوا

ے معلوم کسے کیسے ہوں اب صبح کے تیور ٭ ہم رات کو دانستہ گزرنے نہیں دیتے

ے زیست سے بنتی نہیں کچھ آج کل ٭ کتنی صدیوں پر ہے بھاری ایک پل

ے کسی سے چلتے چلاتے دُعا سلام بہت ٭ وہ عمر بھر کی رفاقت، وہ چاہتیں مت ڈھونڈ

ے مُسکراتے ہوئے چہروں پہ نہ جا ٭ بے بسی بھیس بدل آئی ہے

ے دستک کی نہ ہمت تھی نہ طاقت نہ اجازت

میں وقت کی دہلیز پہ حیران کھڑا تھا

اور جب یہ دستک کی اجازت نہ ملے، نہ ہمت باقی رہے اور تحیّر میں

شدّت آجائے تو انسان کا سارا ذہنی کرب سوالیہ نشان بن جایا کرتا ہے۔

شعری مجموعے **سوالیہ نشان** کے سارے مزاج میں سوالات رچے بسے ہیں۔ اگر ہم اس مجموعے کو ایک جسم قرار دیں تو سوالات رگ و ریشے کی طرح اور لہو کی گردش کی طرح اِس کے وجود میں پھیلے ہوتے ہیں۔ چنانچہ بہت سی غزلوں کی ردیفیں سوالیہ اور استفہامیہّ ہیں یا اُن میں یاس و محرومی کا منفی رویّہ جھلکتا ہے۔ مثلاً ایسا کیوں، شاید، کچھ بھی نہیں، دکھائی نہ دی، نہ تھا، بیکار تھا، مجبور، تنہا، بات نہ کر، مت ڈھونڈ وغیرہ ان ردیفوں کے حامل چند اشعار ملاحظہ کیجئے:

ے نہ اتنی چاہ بڑھا مجھ سے اے مری ہستی ؎ میں پیار کر نہ سکوں تجھ سے ٹوٹ کر شاید

ے عُمر بیتی، مگر تہی کشکول ؎ صرف میرا ہی پیار ایسا کیوں؟

ے اک توہّم زندگانی کا سنبھالے تھا مجھے ؎ میری جانِ ناتواں کا امتحاں بیکار تھا

اِن ردیفوں کے تلازمے سے ہٹ کر بھی شعروں میں یہ سوالیہ نشان موجود ہے۔

ے میں بارِ قرضِ جاں سے سبک ہو کے سو سکوں
اے زندگی بتا ترا کتنا حساب ہے؟

ے ہر ایک حرف سے پُوچھا ہر ایک نقطے سے
مرا سوال مگر تشنۂ جواب رہا

مَیں نے اوپر عرض کیا تھا کہ شیخ محمد اقبال کے **سوالیہ نشان** کو پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ مراجعت کا سفر ہے۔

لیکن حقیقت میں ایسا نہیں ہے۔ یقین سے تشکیک کی جانب چلنے کو ہم مراجعت کا سفر نہیں کہہ سکتے۔

یہ اصل میں ذہنی بالیدگی اور تخلیقی بصیرت کے ارتقاء کا عمل ہے یہ فکری مدارج کی بلندی کا عمل ہے۔ یقین کے بعد تشکیک اس لئے ہوتی ہے کہ اس دُھند سے گزرنے کے بعد تیقن کی روشن تر فضا میں پہنچا جا سکے۔ تشکیک کی بُنیاد اس امر پہ ہوتی ہے کہ کسی شخص کی ذہانت اور فراست کسی ایک مقام پر جامد نہیں ہے۔ بلکہ اُس میں اضطراب اور تجسّس کی شعلگی ہے جو اُسے متحرک رکھتی ہے تاکہ وہ عرفان و آگہی کی رفیع تر منزلوں کی جانب مائل پرواز ہے۔ لاالٰہ (یعنی نفی کا مقام) اِس لئے ہے کہ الاّ اللہ (یعنی اثبات کی منزل) تک رسائی ہو۔ اور جب ایک متجسّس انسان توحید شناسی کی منزل میں پہنچ جائے تو وہاں سے توحیدِ خالص کے نازک، نفیس اور رفیع مقامات کا سفر شروع کر سکے اور اِس پرواز کی بے کرانیوں کا اندازہ ایک مردِ عارف ہی کر سکتا ہے۔ کیونکہ وارداتِ قلبی کی کیفیات علامہ اقبال کے اِس شعر کے مصداق لاتنا ہی ہیں۔

ع ہر لحظہ نیا طور، نئی برقِ تجلّی
اللہ کرے مرحلۂ شوق نہ ہو طے

ہم اسے ایک عام مثال سے یوں سمجھا سکتے ہیں کہ ہمیں ہوائی جہاز سے سفر کرنا ہے، ہم زمین پر کھڑے ہیں، آسمان پہ بادل گھرے ہوئے ہیں، ہم جہاز میں بیٹھے ہیں، جہاز چلتا ہے، بادل ہمارے سر پہ ہیں، جہاز اُوپر اُٹھتا ہے۔ بُلند ہوتا ہے، منظر بدل جاتا ہے، بادل ہمارے نیچے ہوتے ہیں، اُوپر چمکیلی دُھوپ ہے، فضا روشن ہے، ہم بُلند سے بُلند تر اور فضا روشن سے روشن تر ہوتی جا رہی ہے۔

چنانچہ **سوالیہ نشان** فکری ارتقاء کا ایک نشان ہے۔ پیش رفت

کا سفر اور اُن بلند ترین منزلوں کی جانب ایک سفر جو تشکیک کی ابر آلود فضاؤں کے بعد شروع ہوتی ہیں اور جن کی روشن پیشانیاں اور منوّر چہرے ہر صاحبِ بصیرت کو اپنی جانب بُلاتے ہیں۔ خود شاعر کے دل کا یہ جذبہ اُس کے ہونٹوں سے بولتا ہے۔

مجھے ہر لمحہ چلنے کا ہُنر دے
مری منزل خُدایا دُور کر دے

عاصی کرنالی

۲۔ ڈاکٹر خورشیدالحسن رضوی

"ساحلِ تشنہ لب" کے بعد پروفیسر شیخ محمد اقبال صاحب کا دوسرا شعری مجموعہ "سوالیہ نشان" آپ کے سامنے ہے۔ دونوں مجموعوں کے موازنے کے بعد یہ کہنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی کہ فن کے سفر میں شیخ محمد اقبال صاحب کی پیش رفت حیرت افزا ہے، اُن کا اسلوب پہلے سے بڑھ کر برجستہ و دل نشین ہو گیا ہے اور اُردو کی شعری روایت میں اس کی جڑیں زیادہ گہری تہوں تک اُتر گئی ہیں۔ "سوالیہ نشان" میں اگرچہ نظمیں بھی شامل ہیں لیکن شاعر کا بیشتر خونِ جگر نگارِ غزل کی آرائش میں صرف ہوا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ شیخ صاحب کو حقیقی مناسبتِ طبع صنفِ غزل ہی سے ہے جو بیک وقت بہت آسان اور بہت مشکل صنف ہے۔ غزل میں بقول شیخ صاحب:

؎ حُسنِ اظہار کا ہے سارا کمال
بات کوئی نئی نہیں ہوتی

اِس حُسنِ اظہار پر انہوں نے عملاً اپنی دسترس ثابت کر دکھائی ہے۔ شدّتِ احساس اور تازگیٔ اظہار کی آمیزش سے اُن کے اسلوب میں ایک چونکا دینے والی جدّت کی کیفیّت پیدا ہو جاتی ہے۔

؎ دستک کی نہ ہمّت تھی، نہ طاقت نہ اجازت
میں وقت کی دہلیز پہ حیران کھڑا تھا

تھی جسم میں جاں، پر وہ کسی اور کی جاں تھی
مَیں جان کے ہوتے ہوئے بے جان کھڑا تھا

ے طوفاں سے گزر کر جو میں پہنچا سرِ منزل
دیکھا تو پذیرائی کو طوفان کھڑا تھا
ے باغِ امروز کے سب پھول ترے ؏ گُل دیروز کی نکہت میری
ے اک دوراہے پہ ہوں کھڑا مبہوت ؏ آج میں بیسویں صدی کی طرح
ے جب کرو ابتدا کی بات کرو ؏ درد کی انتہا نہیں کوئی
ے چھوڑ کر حُسنِ فطرت کی آغوش کو
گاؤں پھرتا ہے اب در بدر شہر میں

شیخ محمد اقبال کے ذاتی المیے یعنی بصارت سے محرومی کا حوالہ جا بجا ان کی شاعری میں اُبھرتا ہے لیکن محض بیانیہ یا خود ترحمی انداز میں نہیں بلکہ ترفّع (SUBLIMATION) کے اُس عمل سے گزر کر جو ذاتی المیے کو کائناتی سطح سے منسلک کر کے اسے شاعری کا ایک گھمبیر موضوع بنا دیتا ہے اور ورائے بصارت ایک جہانِ بصیرت کی نشاندہی کرتا ہے۔

ے جو میں نے اُس کو نہ دیکھا، تو اُس نے کب دیکھا
ہے زندگی بھی مری طرح بے بصر شاید
ے مری سوچوں کو بینائی عطا کر ؏ مرے جذبوں میں رنگِ زیست بھر دے
ے ترے وجود کی نس نس سے آنکھ جھانکے گی
اگر ہے ذوقِ تماشا نظر کی بات نہ کر

زندگی کی طرف شیخ محمد اقبال کا اساسی رویّہ رومانی ہے یعنی وہ جذبے کو تعقّل پر اور خواب کے حُسن کو حقیقت کی سنگینی پر فوقیت دیتے ہیں لیکن دوسری طرف زندگی کے کڑے حقائق کو قبول کرنے کے بارے میں وہ بڑے حقیقت پسند ہیں۔

؎ جو مل سکے اُسے لے لے اُسے غنیمت جان
سفر سفر ہے یہاں گھر کی راحتیں مت ڈھونڈ

؎ جو حالِ دل تجھے کہنا ہے مختصر کہہ دے
طویل شام و سحر کی فراغتیں مت ڈھونڈ

؎ ہوں وقت کے تیوروں سے واقف
کھڑا ہے وہ، میں گزر رہا ہوں

وقت کے ان تیوروں کے رُوبرو شیخ محمد اقبال صاحب کا دل تو بہت دُکھا ہوا ہے لیکن اُن کا ردِّ عمل بے چارگی و سرافگندگی کا نہیں عزم و ہمّت کا ہے۔

؎ مجھ کو اے وقت کی ہوا نہ ڈرا
میں تو جاں سے گزرنے نکلا ہوں

؎ بلندیوں سے محبّت سی ہوتی جاتی ہے
مرے وجود کو مل جائیں بال و پر شاید

شیخ صاحب کے ہاں عزم و ہمّت کی یہ مثبت کیفیّت ہمدردیٔ بنی نوعِ انسان کے اُس وسیع احساس پر منتج ہوتی ہے جو خاصی کمیاب ہے اور جہاں انسان کو اپنا ذاتی دُکھ انسانیت کے دُکھوں کے مقابلے میں ہیچ نظر آنے لگتا ہے اور ذاتی سُکھ ان کے تناظر میں ایک خلش بن کر دل میں کھٹکنے لگتا ہے:

؎ دیکھا ہے کچھ اِس طور زمانے کا تڑپنا
ہم اپنا ہر اک زخمِ جگر بھول گئے ہیں

؎ ہوا راکھ راکھ گلشن، نہ بچا کوئی ٹھکانہ
میں بچا کے کیا کروں گا فقط اپنا آشیانہ

حیات و کائنات کے یہی دُکھ سُکھ شیخ محمد اقبال کا سرمایہ ہیں اور ان ہی سے وہ "سوالیہ نشان" اُبھرتا ہے۔ جسے ماتھے پر سجائے وہ دستِ فن سے دروازۂ زیست پر مسلسل دستک دے رہے ہیں۔

ڈاکٹر خورشید رضوی
اسلام آباد

فہرست

نمبر شمار	عنوان	صفحہ نمبر

صفحہ نمبر	عنوان	نمبر شمار





مجھے ہر لمحہ چلنے کا ہُنر دے
مِری منزل خُدایا دُور کر دے

مِری سوچوں کو بینائی عطا کر
مِرے جذبوں میں رنگِ زیست بھر دے

دلِ شب پر بس اتنا سا کرم کر
سحر ممکن نہ ہو خوابِ سحر دے

زمینِ چشم کے شایاں خُدایا!
نیا گردوں نئے شمس و قمر دے

میں دو حِصّوں میں بٹتا جا رہا ہوں
نظر کو دِل مِرے دل کو نظر دے

میں یخ موسم میں جم جاؤں نہ یارب
مِرے قلب و نظر میں آگ بھر دے



ہنسنا عذاب تھا کبھی رونا عذاب تھا
سچ پوچھئے تو دوستو! ہونا عذاب تھا

آنکھوں میں ٹھونس ٹھونس کے بیداریاں بھریں
وہ دن بھی آ گئے تھے کہ سونا عذاب تھا

وہ جس سے کھیل کود کے اک عمر کاٹ دی
اک قہر بن گیا تھا کھلونا عذاب تھا

موسم کے ساتھ شہر کی قدریں بدل گئیں
میرے لئے تو داغ کو دھونا عذاب تھا

آسیب کی طرح دل و جاں پر سدا سوار
یادوں کو حرف حرف پرونا عذاب تھا



جو رنج و راحتِ ہستی سے آشنا نہ ہوا
بلا سے اپنی وہ سینے میں دل ہوا، نہ ہوا
جو سنگ و خشت کے پیماں تھے سب غلط ٹھہرے
کوئی بھی گرتے مکانوں کا آسرا نہ ہوا
اُجالے آئے تھے میرے غریب خانے پر
اندھیری رات کو دیکھا تو حوصلہ نہ ہوا
ہُنر کی بات بنی اور نہ علم و دانش کی
جو تیر وقت نے چھوڑا کبھی خطا نہ ہوا
اندھیری رات نے ڈھونڈا نگر نگر مجھ کو
میں تیرے گھر میں چھُپا تھا کہ سامنا نہ ہو
ہماری ذات میں تھی ایسی دلکشی اقبالؔ
جو ایک بار مِلا غم کبھی جُدا نہ ہوا



نہ راس آئے مجھے لوٹ کر بھی گھر شاید
تمام عُمر ہو تقدیر میں سفر شاید

جو مَیں نے اُس کو نہ دیکھا، تو اُس نے کب دیکھا
ہے زندگی بھی مری طرح بے بصر شاید

بُلندیوں سے محبّت سی ہوتی جاتی ہے
مرے وجُود کو مل جائیں بال و پر شاید

نہ اتنی چاہ بڑھا مجھ سے اے مری ہستی
مَیں پیار کر نہ سکوں تجھ سے ٹوٹ کر شاید

کرن کرن سے ٹپکتی ہیں وحشتیں شب کی
مرے نصیب کے محور میں ہے سحر شاید

طویل ہوتا چلا جا رہا ہے قصّۂ غم
کسی بھی موڑ پہ ہو جائے مختصر شاید



ہمّتِ عالی لو ہیں بے بال و پَر اچھّا لگا
آنسوؤں میں مُسکرانے کا ہُنر اچھا لگا

سوچ کر میں نے چُنی ہے آخری آرام گاہ
میں تھا مٹّی اور مجھے مٹّی کا گھر اچھّا لگا

منزلوں کی بات چھوڑو کس نے پائیں منزلیں
اِک سفر اچھّا لگا، اِک ہمسفر اچھّا لگا

عقل کی منطق جُدا ہے، دل کی منطق ہے جُدا
جس کا سایہ غیر کے گھر تھا، شجر اچھّا لگا

گر کبھی فُرصت میسّر ہو تو دل سے پُوچھنا
چاہتوں کا یہ نگر یا وہ نگر اچھّا لگا

آ بسی جو آنکھ میں صُورت، دل و جاں بن گئی
جو لگا اچھّا ہمیں وہ عُمر بھر اچھّا لگا



تو آئے ہستی لہرائے تیری بات کچھ اور
تو آئے سب کچھ مل جائے تیری بات کچھ اور

ساری دُنیا آنسو پونچھے لیکن سب بے سُود
ساری دُنیا گلے لگائے تیری بات کچھ اور

پھول کھلیں کلیاں مُسکائیں لیکن دل بے چین
ایسے میں گر تو آ جائے تیری بات کچھ اور

تیرے پہلو میں اے ساجن سارے غم اکسیر
تو مل جائے سب کچھ بھائے تیری بات کچھ اور

میرے جنوں کی شعلہ بیانی عالم میں مشہور
تیرے آگے لب نہ ہلائے تیری بات کچھ اور

مَیں سارے ہنس کھیل کے سہہ لوں اپنے تیرے غم
لیکن تجھ پہ آنچ نہ آئے تیری بات کچھ اور



آئے تھے اِس جہاں میں لئے دل اُداس اُداس
اَب جا رہے ہیں چھوڑ کے محفل اُداس اُداس
ایسا نہ ہو کہ سِسکیاں بھر دوں فضاؤں میں
فِطرت نہ مُسکرا، ہے مِرا دل اُداس اُداس
اے فصلِ گُل سمیٹ لے سب اپنی نکہتیں
ہر چشم اشکبار ہے، ہر دِل اُداس اُداس
اے نُکتہ داں! اگر تجھے مولیٰ نگاہ دے
رَہرو کے دل کو پڑھ، سرِ منزل اُداس اُداس
دِل کا بھی پاس، ہم کو زمانے کا بھی لحاظ
خوشیوں میں تیری ہم بھی ہیں شامل اُداس اُداس



ہر ایک حرف سے پُوچھا ہر ایک نُقطے سے
مِرا سوال مگر تشنۂ جواب رہا



عُمر بھر انتظار ، ایسا کیوں ؟
میرے پروردگار! ایسا کیوں ؟

اُس پہ جاں دے جسے خبر بھی نہیں
اے دلِ بے قرار! ایسا کیوں ؟

عمر بیتی مگر تہی کشکول
صرف میرا ہی پیار! ایسا کیوں ؟

وائے قسمت کہ ہجر ہے نہ وصال
اے وفا کے دیار! ایسا کیوں ؟

کوئی نغمہ نہ کوئی آہ و فغاں
بے صدا دل کے تار! ایسا کیوں ؟

میں کہ پھولوں سے زخم زخم ہوا
اے خدائے بہار! ایسا کیوں ؟

تجھ سے بدلی نہ میرے دل کی رُتیں
موسمِ برگ و بار! ایسا کیوں ؟



کوئی شک ہے نہ یقیں، کچھ بھی نہیں
پاس اب کچھ بھی نہیں، کچھ بھی نہیں

اِک خلش سی ہے، لئے پھرتی ہے
اے دلِ زار! کہیں کچھ بھی نہیں

کوئی بُت خانہ، نہ کافر صُورت
تیرے شایانِ جبیں کچھ بھی نہیں

اَب کوئی شہر نہ گاؤں آباد
خاک پر خاک نشیں، کچھ بھی نہیں

نوچ لی آنکھ سے کِس نے دُنیا
آسماں ہے نہ زمیں کچھ بھی نہیں

جانے کس وہم کی زَد میں ہے کہ آج
دل نہ شاداں نہ حزیں کچھ بھی نہیں

آ کہ ہم دونوں ہی ہنس لیں، رو لیں
سر پہ دُنیا ہے نہ دیں کچھ بھی نہیں



دل میں جب کوئی ہر پَل ہوگا
آنکھ سے کیسے اوجھل ہوگا

کِس نے ہوا میں دیپ جلایا
کوئی مجھ سا پاگل ہوگا

اے دل دیکھ نہ سُندر سپنے
آنکھ کُھلی تو بے کل ہوگا

دل اپنا اور پیار پرایا
کوئی اس کا بھی حل ہوگا

نام لیا اور آنکھ بھر آئی
تن من سارا جل تھل ہوگا



اِک چشمِ التفات نے دیکھا جو ایک بار
کتنے حسین لوگ مجھے یاد آ گئے



نہیں ہے تاب مرے دل قیامتیں مت ڈھونڈ
فریب کھاتا چلا جا صداقتیں مت ڈھونڈ

جو مل سکے اُسے لے لے اُسے غنیمت جان
سفر، سفر ہے یہاں گھر کی راحتیں مت ڈھونڈ

جو حالِ دل تجھے کہنا ہے مختصر کہہ دے
طویل شام و سحر کی فراغتیں مت ڈھونڈ

کسی سے چلتے چلاتے دُعا سلام بہت
وہ عُمر بھر کی رفاقت، وہ چاہتیں مت ڈھونڈ



لب پہ آئے تو جاں میں جاں آئے
زندگی تیرا نام ہے شاید



بلا لکھ رہا ہوں، بلا سوچتا ہوں
میں اپنی حدوں سے سوا سوچتا ہوں

خفا ہونے والے یہ تُو نے ہی دی تھی
وہ اِک سوچ جس کو سدا سوچتا ہوں

یونہی لوٹ جاؤں کہ دُوں دَر پہ دستک؟
مَیں صدیوں سے گُم سُم کھڑا سوچتا ہوں

مجھے دل میں رکھنے کی عادت نہیں ہے
مگر کیسے کہہ دُوں مَیں کیا سوچتا ہوں؟

مِرے ساتھ تھا آرزوؤں کا لشکر
سفر میں کہاں کھو گیا، سوچتا ہوں

وہ کیا وقت تھا تُو نے سوچا تھا مجھ کو
میں اکثر یہی اے خدا سوچتا ہوں



وہ بھیڑ تھی انسان پہ انسان کھڑا تھا
ہر شہر جگر تھامے پریشان کھڑا تھا

دستک کی نہ ہمّت تھی نہ طاقت نہ اجازت
میں وقت کی دہلیز پہ حیران کھڑا تھا

رستے کی کڑی دھوپ نے سہلا دیا ہر زخم
میں پیڑ کے سائے میں پریشان کھڑا تھا

تھی جسم میں جاں پر وہ کسی اور کی جاں تھی
میں جان کے ہوتے ہوئے بے جان کھڑا تھا

طوفاں سے گزر کے جو میں پہنچا سرِ منزل
دیکھا تو پذیرائی کو طوفان کھڑا تھا



تمام عُمر کہیں زندگی دکھائی نہ دی
میں سورجوں میں رہا روشنی دکھائی نہ دی

نظر کو لگ گئی ایسی نظر زمانے کی
ترے جمال میں بھی دلکشی دکھائی نہ دی

ہر ایک آنکھ گڑی اُس کے ہنستے ہونٹوں پر
کسی کو آنکھ مری بھیگتی دکھائی نہ دی

لگا ہے تُو بھی مجھے کوسنے سرِ محشر
تجُھے بھی مولا مری بے بسی دکھائی نہ دی

مَیں تیری آنکھ سے دیکھوں کہ اپنی آنکھوں سے
مجھے تو دَہر میں کوئی خوشی دکھائی نہ دی



اِک سرابِ جسم و جاں تھا، مَیں نہ تھا
اِک مِرا وہم و گماں تھا، مَیں نہ تھا

دیدۂ احساس کی اِک سہو تھا
ایک سایہ سا رواں تھا، مَیں نہ تھا

میری ہونے سے کوئی نسبت تھی کب
سوچ کا وہم و گماں تھا، مَیں نہ تھا

میری ہمّت؟ کاکل و عارض کی بات
جذبۂ شیریں بیاں تھا، مَیں نہ تھا

مَیں نے کب ہوش و خِرد کی بات کی
کوئی وہمِ نکتہ داں تھا، مَیں نہ تھا



کرے ماتمِ قلب و جاں کس کو فُرصت
یہ دُنیا ہے پیارے! یہاں کس کو فُرصت

تُو اے دیدۂ دل بُرا مت منانا
سُنے جو تری داستاں، کس کو فُرصت

تُو اے زندگی! اپنے غم ساتھ لے جا
بنے اب کوئی رازداں، کس کو فُرصت

ہر اِک دوڑتا بھاگتا جا رہا ہے
سُنے تیری، عُمرِ رواں! کس کو فُرصت

اُٹھ اے، صُبحِ فردا! خود اپنی خبر لے
ہر اک محوِ کارِ جہاں کس کو فُرصت

فریبِ سفر

در بُلاتے رہے گھر بُلاتے رہے
مَیں نے سب کچھ سُنا پھر بھی چلتا رہا
میرا راہوں سے بھی کوئی رشتہ نہ تھا
اور منزل سے بھی آشنائی نہ تھی
صرف چلتا رہا
مَیں کہ انسان تھا تھک گیا ایک دن
پھر کوئی در، کوئی گھر، کوئی راستہ، کوئی منزل نہ تھی
صرف میری تھکن ہی مِرے ساتھ تھی
جس کی آغوش میں
جانے کب سو گیا
جانے کب کھو گیا



جینے نہیں دیتے مجھے مرنے نہیں دیتے
یہ لوگ کوئی کام بھی کرنے نہیں دیتے

غارت گرِ تسکین سہی پیار کے لمحات
لیکن مری ہستی کو بکھرنے نہیں دیتے

ہے ساکھ زمانے میں اِسی بات سے قائم
ہم بوجھ کبھی سر سے اُترنے نہیں دیتے

معلوم کسے، کیسے ہوں اب صبح کے تیور
ہم رات کو دانستہ گزرنے نہیں دیتے

اِک ٹیس بھی اُٹھتی ہے تو کہہ دیتے ہو اشعار
تُم درد کو اقبالؔ نکھرنے نہیں دیتے



ہے بھری بزمِ ہم مگر تنہا
دیدہ و دل کا ہے نگر تنہا

ایک میں تھا کہ اشکبار رہا
دن کے ماتم میں رات بھر تنہا

آنکھ کے شہر میں بلا کا ہجُوم
دل کی بستی کے سارے گھر تنہا

جسم کے سارے در مقفّل ہیں
چشمِ نم کا کُھلا ہے در تنہا

چند یادیں ہیں اَب فقط جیسے
جَلتے جنگل میں اِک شجر تنہا

دل ہو آباد تو جہاں آباد
دل ہو تنہا تو بحر و بر تنہا



مرے رفیقِ سفر بام و در کی بات نہ کر
ردائے شوق کے ہوتے شجر کی بات نہ کر
ترے وجُود کی نَس نَس سے آنکھ جھانکے گی
اگر ہے ذوقِ تماشا منظر کی بات نہ کر
درِ حیات پہ دستِ ہنر سے دے دستک
ہمم کے باب میں خوف خطر کی بات نہ کر
اگر ہے منزلِ مقصود کی تڑپ، چل پڑ
کسی رفیقِ سفر، راہبر کی بات نہ کر
ترے دُکھوں کا مداوا ہے خود ترے بس میں
کسی طبیب کسی چارہ گر کی بات نہ کر



سبھی سوچوں کا حاصل سوچنا ہے
تجھے پل پل مرے دل سوچنا ہے

جہاں کے کام یوں تو سب کٹھن ہیں
مگر در اصل مشکل سوچنا ہے

مرے بے کیف غم بے لطف خوشیاں
مرے جذبوں میں شامل سوچنا ہے

تسلّی ذہن کو دے دوں گا لیکن
کوئی حل دل کے قابل سوچنا ہے

مرے شانوں پہ ہے بارِ امانت
مجھے موجوں میں ساحل سوچنا ہے

تجاہل کے مزے معلوم لیکن
مجھے اک روز غافل سوچنا ہے



برباد شہر شہر تھا میں بھی بچا نہ تھا
یہ اور بات میری زباں پر گلہ نہ تھا

اُس سے بچھڑ کے زندگی مجھ پر حرام تھی
زندانیٔ حیات تھا، میں بے وفا نہ تھا

ہمّت کی اِک ردا تھی مرے پاس اوڑھ لی
عُریانیاں چُھپانے کو کچُھ بھی رہا نہ تھا

ہمّت کی آنکھ دیکھ کے غمناک ہو گئی
منزل کے بعد اور کوئی راستہ نہ تھا

لفظوں کا سارا کھیل تھا لفظوں سے ہیں تہی
تیرا کوئی قصُور دلِ بے نوا نہ تھا



جینے تو ہیں جینے کا ہُنر بُھول گئے ہیں
ہم رات کے پہلو میں سحر بُھول گئے ہیں

چل پڑتے ہیں اندازوں کی اُنگلی کو پکڑ کر
ہم آنکھ میں موجود نظر بُھول گئے ہیں

دُنیا کو نئی راہ نئی سمت دکھا کر
لوٹے ہیں تو ہم اپنا ہی گھر بُھول گئے ہیں

دیکھا ہے کچھ اس طور زمانے کا تڑپنا
ہم اپنا ہر اک زخمِ جگر بُھول گئے ہیں

اِس دُھن میں کہ چونکائیں گے ہم بزم کو جا کر
دوڑے ہیں کچھ اِس طرح، خبر بُھول گئے ہیں



اعتمادِ ذات کی مالا جپو!
اسمِ اعظم یہ بھی ہے اک دوستو
نغمہ زن ہے گو ربابِ جسم بھی
آج لیکن رُوح کے نغمے سُنو
مُڑ کے تکنا شرعِ ہمت میں حرام
دوستو چلنے سے پہلے سوچ لو
عزم و ہمّت سے جبینِ وقت پر
چاند لکھو اور کبھی سُورج لکھو
عزمِ تازہ کی ردائیں اوڑھ کر
سُورجوں کے شہر میں چلتے چلو
ڈھال کر ذوقِ یقیں سے ماہتاب
تیرہ راتوں کے مُقدّر پھیر دو
نصرتیں خُود بڑھ کے چُومیں گی قدم
اشہبِ ہمّت کی باگیں تھام لو



ہاں ہاں کا گزیدہ ہوں نہیں اوڑھ رہا ہوں
میں جسم پہ ملبوسِ یقیں اوڑھ رہا ہوں

دیں جو بھی مرے دوست اسے نام، مگر میں
عُریانی چُھپانے کو زمیں اوڑھ رہا ہوں

پگھلا کے نہ رکھ دے کہیں یہ دہر کا سورج
مَیں اپنی حفاظت کو یہ دیں اوڑھ رہا ہوں

لگ جائے مری آنکھ بھی کچھ دیر تو سو لوں
سونے کے لئے خوابِ حسیں اوڑھ رہا ہوں



جس لمحہ ٹوٹی چھت مرے اپنے مکان کی
ایسا لگا کہ سر پہ مرے آسماں نہ تھا

حیرت کدہ

تُم مت مانو لیکن یارو
میں زیست کو، اک حد تک ہی سہی
پر سمجھ گیا پہچان گیا

لیکن اک شخص جو میرا تھا میں جس کا نہ تھا
اِک راز رہا اُس کی سوچیں اِک بھید رہیں

تم مَت مانو لیکن یارو
مَیں اللہ کو کچھ کچھ ہی سہی
پر جان گیا پہچان گیا

لیکن اِک شخص جو میرا تھا میں جس کا نہ تھا
اِک راز رہا اُس کی سوچیں اِک بھید رہیں



یہ اور بات دل و جاں بکھر گئے ہوتے
عروسِ شوق کے گیسو سنور گئے ہوتے

سُنایا جس کو بھی ، پایا ذرا سا درد شناس
جو حالِ دل نہ سُناتے تو مر گئے ہوتے

اندھیری رات کی صُورت بڑی بھیانک تھی
اُجالے دیکھنے آتے تو ڈر گئے ہوتے

اگر نہ ہوتا سدا سر پہ یاد کا آسیب
جو چار دن تھے سکوں سے گزر گئے ہوتے

تڑپ کے مرنا ہی میرا اگر مقدّر تھا
کرم یہ اپنے ہی ہاتھوں سے کر گئے ہوتے



کل بھی کمبخت، آج بھی کمبخت
دل کی چاہت سدا رہی کمبخت

آخرش موت نے سکُون دیا
کام آئی نہ زندگی کمبخت

ایک لمحہ بھی خوش نہ رہنے دیا
دشمنِ جاں تھی آگہی کمبخت



دیوار و دَر ہیں دیکھ کے سکتے ہیں آج تک
آنگن سے کون تازہ ہوا چھین لے گیا



فضا سے بیر ہواؤں سے دشمنی ہوگی
وفا کے شہر میں کچھ اور بے کلی ہوگی

دل و دماغ کا میں بوجھ سر پہ کیوں لادوں
دیارِ شوق میں کس چیز کی کمی ہوگی

ہوائے تُند میں ہم بے چراغ ہی اچھے
بُجھے چراغ تو کچھ اور تیرگی ہوگی

مرا ہی پیکرِ بے جاں ملا تھا کیوں آخر
مری حیات کئی بار سوچتی ہوگی

فلک کو دیکھ کے میرے نصیب پر لرزاں
زمیں کو اپنی حفاظت کی پڑ گئی ہوگی

لو آگیا مرے جانے کا، کوچ کا لمحہ
گماں یہی تھا بڑی زندگی پڑی ہوگی



دلِ حزیں میں کسی انتظار کی خوشبو
خزاں نصیب رُتوں میں بہار کی خوشبو

اُڑا کے لے گیا جھونکا کہاں خُدا جانے
تھی مرغزار ترے مرغزار کی خوشبو

زمینِ ذہن پہ کرتی ہے کیا چمن ایجا
کسی اُمید کسی اعتبار کی خُوشبو

یہیں کہیں ہے ابھی قافلہ بہاروں کا
بتا رہی ہے مجھے رہ گذار کی خوشبو

وہ خار زار سے گلشن تراش لیتے ہیں
نہیں نصیب جنہیں لالہ زار کی خُوشبو

عفونتوں کے جزیرے میں گھُٹ رہی ہے حیات
خدائے مہر و وفا! کوئی پیار کی خوشبو



زیست بھی کم تھی نہ دلکش، موت کی حسرت بھی تھی
سیکڑوں غم تھے جہاں کے اور تری چاہت بھی تھی

سیلِ بے پایاں کو میرے بس میں کب تھا روکنا
دل بھی تھا مائل بہ گریہ اور کچھ فرصت بھی تھی

محوِ حیرت ہوں کہ ہوں زندہ سلامت آج بھی
دل بھی نازک کم نہ تھا اور درد میں شدّت بھی تھی

بس دلِ سادہ سے یارو! جھوٹ کیسے بولتا
کچھ تقاضا وقت کا تھا کچھ مری عادت بھی تھی



ساری خوشیاں سمیٹنا چاہے
دامنِ دل ترا جواب نہیں



میں اپنی منزل کا راستہ ہوں
بہت ہی آگے نکل گیا ہوں

زمین نیچے کہاں ہے میرے
میں اپنے پاؤں پہ چل رہا ہوں

سفر کا آغاز ہے کہ منزل
میں اپنی ہمّت سے پوچھتا ہوں

غزل کہاں میرے غم کو سمجھے
میں اپنے ہونے کا مرثیہ ہوں

پڑھو پڑھاؤ کہ پھینک ڈالو
کتاب لکھنی تھی لِکھ چُکا ہوں

ہوں وقت کے تیوروں سے واقف
کھڑا ہے وہ میں گزر رہا ہوں



میرا عزمِ نَو ترا عزمِ جواں بے کار تھا
شور بنجر دھرتیوں میں باغباں بے کار تھا

بارشوں کی برہمی تھی اور کبھی سورج کا غیظ
میرے ننگے سر پہ نیلا سائباں بیکار تھا

مَیں نے خود ذوقِ نظر سے گھڑ لئے شمس و قمر
میرے روز و شب پہ پھیلا آسماں بیکار تھا

اِک تَوَہم زندگانی کا سنبھالے تھا مجھے
میری جانِ ناتواں کا امتحاں بے کار تھا

دین تھی جس کی، وہی اس کا محافظ بھی تو تھا
دوستو! فکر و غمِ عُمرِ رواں بے کار تھا

مَیں جبینِ وقت پہ لکھّا گیا تھا دوستو!
میرا حرف و صوت سے رشتہ کہاں بیکار تھا



زیست سے بنتی نہیں کچھ آج کل
کتنی صدیوں پہ ہے بھاری ایک پَل

شل ہوئے جاتے ہیں پاؤں آس کے
خواہشِ موہوم اب تُو ہی بدل

چلچلاتی دھوپ اور لمبا سفر
عزم و ہمت کی گئیں چیخیں نکل

اپنے آنسو پُونچھ اپنے ہاتھ سے
گر سنبھلنا ہے تجھے خُود ہی سنبھل

سنگ و آہن کو ہوں جان و دل عطا
اے دل و جاں ایسا اِک کوئی عمل

تو چلی ہے عُمر بھر غیروں کے ساتھ
زندگی آ، آج میرے ساتھ چل

نیا جنم

نہ جانے دل کیوں سنبھل گیا ہے
نہ جانے کیوں جاں بہل گئی ہے

نہ کوئی نغمہ نہ کوئی نالہ
حیات سوئی ہوئی ہو جیسے

وجود مفلوج ہو گیا ہو
کوئی کسک پھر کوئی تڑپ پھر
کہ جس کو لے کر کسی کے در پر

میں پھر سے جاؤں کھڑا رہوں نامراد لوٹوں
حیات جاگے وجود جاگے، سکوت ٹوٹے تو جان چھوٹے



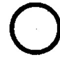
جینے کا حوصلہ ہے نہ مرنے کی تاب ہے
ہر عہدِ زندگی سے مرا آب آب ہے

میں لکھ رہا ہوں خواہشوں کے باب میں کتاب
اور حسرتوں کے نام مرا انتساب ہے

اِس باب میں خِرد کا کہاں کوئی اختیار
میرا نہیں یہ دل کا مرے انتخاب ہے

میں بارِ قرضِ جاں سے سُبک ہو کے سو سکوں
اے زندگی بتا ترا کِتنا حساب ہے

تاب و تواں کہاں کہ مَیں اب ساتھ دے سکوں
اے دل فریب خواہشو! میرا جواب ہے



کبھی آس نے رگیدا کبھی آرزو نے مارا
کوئی پھونک ڈالے کشتی کوئی نوح بے کنارا

شبِ زلیست کیسے گذری یہ تو میں ہی جانتا ہوں
کبھی آہ کام آئی کبھی اشک کا سہارا

مرے سامنے تھا دریا تجھے اے خدا خبر تھی
مرے واسطے بہت تھا ترا ایک ہی اشارہ

یہی کم ہے کیا کہ خوش ہوں کسی وہم کے سہارے
یہاں کب کسی کے ہم ہیں یہاں کون ہے ہمارا

یہ تری رضا تھی مولا مگر اسمیں راز کیا تھا
کبھی ہار کر میں جیتا کبھی جیت کر بھی ہارا

میں زباں پہ نامِ اُلفت کبھی بھول کر نہ لاتا
یہی شرطِ زلیست ٹھہری مِرے پاس کیا تھا چارا؟

غمِ زندگی نے آخر مرے پاس کچھ نہ چھوڑا
نہ وہ عشق کی خلش ہے نہ وہ حُسن کا نظارا



حق کی اِک بات کرنے نکلا ہوں
اپنے ہاتھوں سے مَرنے نکلا ہوں

چند نشتر لگا کے سوچوں کے
زیست کے زخم بھرنے نکلا ہوں

اے زمانے نہ رحم کر مجھ پر
تیرے ہاتھوں سنورنے نِکلا ہوں

زندگی میرا اعتبار نہیں
تجُھ پہ الزام دھرنے نِکلا ہوں

مجھ کو اے وقت کی ہَوا نہ ڈرا
میں تو جاں سے گذرنے نِکلا ہوں

دھول ہی دھول ہے زُہے قسمت
آج بننے سنورنے نکلا ہوں



ابر مجبور ہے صبا مجبور
حُسنِ فطرت کی ہر ادا مجبور

وہم بے چارگی ہے مختاری
زیست کا سارا سلسلہ مجبور

دیکھ کر سلسلے ستم کے دراز
مجھ کو لگنے لگا خُدا مجبور

اشک وہ بھی نہ اپنے روک سکا
ملک الموت تھا بڑا مجبور

میری قسمت تھی یا مزاج مرا
جبر تھا یا نہ تھا رہا مجبور

خود ہی رو خود ہی پونچھ اشک اقبالؔ
ہر کوئی تجھ سے کچھ سوا مجبور



کوئی بھوکا ہے کوئی بے گھر ہے
زندگی زندگی پہ دو بھر ہے

دِل کو تسکین دیتا رہتا ہوں
مفلسی زندگی کا زیور ہے

کتنی اُلٹی ہے خواب کی تعبیر
آدمی آدمی کا چاکر ہے

کِس کو ہے ہوش دل لگانے کا
جو بھرے پیٹ، اپنا دلبر ہے

ہو گئیں نذر آپا دھاپی کی
کون دُختر ہے کون خواہر ہے

تھی قیامت تو ایک دن آنی
کیوں بپا روز، روزِ محشر ہے

وہ تو تیرے حبیب تھے مولا
زندگی آج جن پہ دو بھر ہے



ظُلمت سے نہ گھبرا کہ بہت رات پڑی ہے
کچھ ذہن کو سمجھا کہ بہت رات پڑی ہے

لمحات کے گننے سے گزرتے نہیں لمحات
قِصّہ کوئی دُہرا کہ بہت رات پڑی ہے

کرنوں کی سخاوت کا گماں شب کے خُدا سے
دامن کو نہ پھیلا کہ بہت رات پڑی ہے

مُمکن نہیں قدرت کے اصُولوں کا بدلنا
ہر آس ہے بے جا کہ بہت رات پڑی ہے

اے جاگنے والے ! ترا سونے میں بھلا ہے
کچھ دیر تو سو جا کہ بہت رات پڑی ہے

جس وقت بھی میں چونک کے سوتا ہوا اُٹّھا
مَیں نے یہی پایا کہ بہت رات پڑی ہے



کوئی منظر آنکھ کو بھاتا نہیں
دل کسی صورت سکوں پاتا نہیں
بخش دے مولیٰ تو ہے تیرا کرم
بے گناہی کی قسم کھاتا نہیں
دل کے آگے راستے ہی راستے
آنکھ کو کچھ بھی نظر آتا نہیں
روشنی نے ایسی آنکھیں کھول دیں
میں اندھیروں سے بھی گھبراتا نہیں
دیدنی ہے حالتِ دل اِن دنوں
درد بھی زخموں کو سہلاتا نہیں



مَیں صاف صاف ترا چہرہ پڑھ نہیں سکتا
زہے نصیب ابھی روشنی ذرا کم ہے



نام سے میرے جو بھی آیا تھا
میں نہیں تھا وہ میرا سایہ تھا

پیڑ تو تھا مرے ہی آنگن میں
پر کہیں اور اس کا سایہ تھا

اپنی ہستی کو بھول بیٹھا تھا
میں نے تجھ کو کہاں بھلایا تھا

چند سکّوں میں اور کیا ملتا
میں کھلونے خرید لایا تھا

کچھ ستم تو لکھا تھا قسمت میں
اور کچھ خواہشوں نے ڈھایا تھا

ہم کو دعویٰ نہ تھا کوئی اقبالؔ
اپنی قسمت کو آزمایا تھا



موت بے وجہ نہیں آئی ہے
ہم نے جینے کی سزا پائی ہے
مُسکراتے ہوئے چہروں پہ نہ جا
بے بسی بھیس بدل آئی ہے
پھر کسی کنجِ سکوں کی خواہش
زندگانی ! تری موت آئی ہے
دیکھنا ، سوچنا ، بے کل رہنا
میری دُشمن مری دانائی ہے
خُوب گزرے گی سحر تک اقبالؔ
دردِ دل ہے شبِ تنہائی ہے



پِس رہا ہے میانِ ارض و سماء
یہ فقط آدمی کی ہمّت ہے



مرنا لازم تھا تو مر ہی جاتا
دل کا کچھ خوف و خطر ہی جاتا

کیا ضروری تھا لگانا دل کا
وقت تو یوں بھی گزر ہی جاتا

رائیگاں تھی کسی مرہم کی تلاش
زخمِ دل تھا کبھی بھر ہی جاتا

جوش میں ہوش نہ اُڑتا اے کاش
دِل کا دریا تو اُتر ہی جاتا

زیست میری کبھی میری ہوتی
میں کوئی کام تو کر ہی جاتا

تھی خوشی، آپ کی مہماں ٹھہری
درد ہوتا مِرے گھر ہی جاتا



باقی ہے ابھی وقت سنبھلنا ہو سنبھل جا
جینا ہو تو احساس کے چنگل سے نکل جا

یہ کس کے لئے خونِ جگر وقفِ سخن ہے
یہ تک بھی نہ سوچا کبھی ، جا جانِ غزل جا

میں اُن کی نگاہوں میں وفا دیکھ رہا ہوں
اے شومئ تقدیر ذرا دیر تو ٹل جا

اب اور نہ گھر پھونک کے یوں دیکھ تماشا
بدلا ہے زمانہ مرے دل تو بھی بدل جا

پہنانے سے قاصر تجھے لفظوں کا لبادہ
احساسِ مسرت مرے ہونٹوں پہ مچل جا

ایسا نہ ہو بھڑکوں تو زمانے کو جلا دوں
اے دردِ غمِ ہجر مجھے چھیڑ نہ ، چل جا

ممکن نہیں کچھ اور تو اتنا ہی کرم کر
خود اپنے ہی ہاتھوں گلِ اُمید مسل جا



گرتے پڑتے کٹی اپنی ساری
پھر بھی آئی نہیں دُنیاداری

دل کو منظور تھی خوشنودئ غم
دل نے پھر جان کے بازی ہاری

ہر گھڑی آنکھ میں سُندر سپنے
ہر گھڑی زیست غموں کی ماری

کچھ نہ ہونے کا، کبھی ہونے کا
خوف ہے سارے جہاں پہ طاری

آج پھر دِل نے اُجالے لکھے
آج پھر رات ہے دل پر بھاری

لب پہ جب نام خوشی کا آیا
درد نے کر دیئے فتوے جاری



دل کے نگر سے درد کا جب قافلہ چلا
میرا وجُود لے کے مجھے ساتھ ہو لیا

میں خُود ہوں آج پیش تری بارگاہ میں
دل کھول کے حیات دے! دینی ہے جو سزا

میں نے تو اپنے خُوں سے رنگے ہیں خود اپنے ہاتھ
دے گا مِرا وجود ہی خود اپنا خُوں بہا



پھیلائی ہے کیا نکہتِ غم دل کے چمن میں
احسان ترا بادِ صبا یاد رہے گا



زندگی پُوچھ نہ قسمت میری
دل لگی تجُھ سے ہے عادت میری

حرف اِک مہر و وفا کا کہہ کر
ڈال دی آپ نے قیمت میری

ارضِ احساس ہے بے آب و گیاہ
رنج میرا ہے نہ راحت میری

جل گئے راکھ ہوئے خواب و خیال
مَیں سُلگتا رہا ہمّت میری

ہو گئی وقت کی ڈولی میں سوار
وہ جو بچپن سے تھی چاہت میری

باغِ امروز کے سب پھُول ترے
گلِ دیروز کی نکہت میری

آج کِس طور ہوں مفلِس اقبالؔ
لُٹ گئی درد کی دولت میری



مرے نقطوں لکیروں میں کوئی تاثیر لکھ دو نا
سخن کی بادشاہت میں کوئی جاگیر لکھ دو نا
مرے ماتھے پہ لکھ دو چاند سورج اپنی چاہت کے
مرے ہونٹوں پہ کوئی سرمدی تنویر لکھ دو نا
تمہارا بھی تو بس ہے تم بھی مالک ہو دل و جاں کی
حنائی ہاتھ سے میری نئی تقدیر لکھ دو نا
کہیں ایسا نہ ہو دیوانگی میں حد سے بڑھ جاؤں
مرے پاؤں میں کوئی آہنی زنجیر لکھ دو نا
حیاتِ تیز رو تھمنے پہ رک جانے پہ مائل ہے
مرے سینے میں کوئی آرزو کا تیر لکھ دو نا
مری آنکھوں میں سارے خواب تم نے ہی سجائے ہیں
کسی سپنے کی کوئی موہنی تعبیر لکھ دو نا



ہُوا راکھ راکھ گلشن نہ بچا کوئی ٹھکانہ
میں بچا کے کیا کروں گا فقط اپنا آشیانہ

نہ سہی حقیقتوں پر، مرا خواب پر تو حق ہے
میں کچھ اور دیر سولوں مجھے دیر سے جگانا

مری شعر و شاعری میں کوئی فلسفہ نہ حکمت
وہی دَرد میٹھا میٹھا، وہی سوزِ جاودانہ

مری بے گناہیوں کا، نہیں معجزہ تو کیا ہے
ابھی بات لب پہ آئی ابھی بن گیا فسانہ

تری چیرہ دستیوں کا یہ کرم بھی کوئی کم ہے
مجھے آگیا ستم گر تہہ دام پھڑ پھڑانا

مجھے چھوڑ کر اکیلا، مری حسرتو! نہ جاؤ
مرا کون ہے جہاں میں کوئی ہے مرا ٹھکانہ



سُورج کے اُجالوں میں شبِ تار ہے درپیش
پھر بابِ کرم سے مجھے انکار ہے درپیش
ممکن ہو تو ہر دیدۂ بینا کو چُرا لے
پھر آنکھ کو اِک حُسن کا دیدار ہے درپیش
چاہوں بھی تو میں ساتھ ترا دے نہیں سکتا
اے خندہ لبی مجھ کو دلِ زار ہے درپیش
اے خوابو! دُعا کے لئے اَب ہاتھ اُٹھاؤ
ہمّت کو مری سایۂ دیوار ہے درپیش
ہر شے پہ گڑی جاتی ہیں نظریں دل وجاں کی
ہیں کیسہ تہی گرمئ بازار ہے درپیش

بند گلی

پیار کرنے کو تم ہی تو تنہا نہ تھے
دل نے تُم کو چُنا جاں نے تُم کو چُنا
حادثہ ہو گیا کیا سے کیا ہو گیا



کھو نہ جائے رفوگری کا ہُنر
اپنا دامن نہ کر رفو اقبال

ٹارچر چیمبر

میں پیار پہ مجبُور ہوں وہ پیار سے معذور
اس میں نہ خطا میری نہ کچھ اُس کی خطا ہے
ہم دونوں ہی اک جبر کے ہاتھوں میں ہیں مجبُور



دل میں اُترا وہ شاعری کی طرح
پھر کہاں کھو گیا خوشی کی طرح

اُس کی اُلفت کا کیا بھروسہ ہے
میری دو روزہ زندگی کی طرح

کس نے بھر ڈالا زندگی میں سرور
چاند چہروں سے دل لگی کی طرح

روز و شب سے نبھائے رکھتا ہوں
ایک پاگل سے دوستی کی طرح

اِک دوراہے پہ ہوں کھڑا مبہوت
آج میں بیسویں صدی کی طرح



کس جوش سے آگے کی طرف دوڑ رہا ہوں
لیکن میں جہاں کل تھا وہیں آج کھڑا ہوں
سوچا تو کہیں اپنا نشاں تک نہیں پایا
دیکھا تو میں افلاک کے ماتھے پہ لکھا ہوں
یہ ہے مری دانش کہ کبھی جان نہ پایا
میں خود سے خفا ہوں کہ زمانے سے خفا ہوں
اے کاش کوئی ہو جو مجھے اتنا بتا دے
اس ہستیٔ دو روزہ میں مَیں کون ہوں کیا ہوں؟
پھر بھی مجھے کیوں جانے شکایت ہے خُدا سے
اقبالؔ میں خود اپنے ہی ہونے کی سزا ہوں



آس کلیوں کو کھلا مت دینا
پیار کی اتنی سزا مت دینا
پھول سپنوں نے انہیں پالا ہے
آرزوؤں کو دغا مت دینا
مجھ کو تعبیر سے ڈر لگتا ہے
خواب آنکھوں میں سجا مت دینا



بعد مرنے کے آشکار ہوا
موت بھی زیست کی ضرورت ہے



سحر گلاب، سمن زار شام تجھ سے ہے
دیارِ حُسن بہاروں کا نام تجھ سے ہے

یہ رنگ و بُو کا تماشا فقط تماشا ہے
رُتوں کے دیس میں یہ دُھوم دھام تجھ سے ہے

نہ تُو مہکتا تو سرمستیاں کہاں جاتیں
ہے بادہ بادہ، ہر اِک جام، جام تجھ سے ہے



میرے قالب میں ڈھل گئی ہے تو کیا
جاں کسی اور کی امانت ہے



جب آس بھی تنہا چھوڑ چلی
جینے سے ہم نے توبہ کی
تم ساتھ ہی لے جاتے اُن کو
دل کس کا تھا جاں کس کی تھی
جب رات آئی تو رات رہی
دن نکلا ہی تھا شام ڈھلی
کوئی لکھتا شکوہ کرتے ہم
ہم نے تو خود تقدیر لکھی
جانے کیا سوچ کے لوٹ گیا
وہ میرے گھر تک آیا بھی
وہ بھی کچھ کھویا کھویا تھا
میں نے بھی کھل کر بات نہ کی



اگر روشنی کا اشارہ نہ پاتا
مہ و مہر سے بام و در کیوں سجاتا
فقط زیست کا مُدعا میں جو ہوتا
تو مجھ کو کوئی یُوں بناتا مٹاتا
ڈبویا مجھے دن کی خوش فہمیوں نے
اگر رات ہوتی تو تنہا نہ جاتا



دن ڈھلا ہے تو ذرا آنکھ کو بینائی ملی
چاند تاروں سے کوئی بزم سجائیں کیسے



جو لکھا ہے میری کتاب میں
نہیں زندگی کے نصاب میں

ہیں وہ شاد کس طرح مان لُوں
میں عذاب میں تُو عذاب میں

کسی تشنہ لب سے تو پُوچھیے
ہے خمار کیا مئے آب میں

کوئی نکہتوں کا اتا پتا
نہ سمن میں اور نہ گلاب میں

مری خواہشیں بھی مری طرح
کبھی جاگتی، کبھی خواب میں

کوئی زندگی ہے وہ زندگی
نہ گناہ میں نہ ثواب میں

کبھی حوصلہ ہو تو دیکھنا
شبِ تار کو شبِ تاب میں



یوں تو اب فاصلہ نہیں کوئی
دُور تک راستہ نہیں کوئی

جب کرو ابتدا کی بات کرو
درد کی انتہا نہیں کوئی

گردشِ دہر تیری ہمّت ہے
تیرے ہاتھوں بچا نہیں کوئی

جتنی کاٹو ہنسی خوشی کاٹو
زندگی ہے سزا نہیں کوئی

روز کی صبحیں روز کی شامیں
زندگی میں مزا نہیں کوئی

سب توہم کی فتنہ سامانی
بے وفا، باوفا نہیں کوئی

تُم کو اقبال سے شکایت ہے
آدمی تو بُرا نہیں کوئی



بد قسمتی نے چپکے سے پھر وار کر دیا
روشن دلوں کو مثلِ شبِ تار کر دیا

اچھّی مرے طبیب نے دی ہے دوائے دِل
صحت کے نام پہ مجھے بیمار کر دیا

دل نے ہزار ساتھ دیا لیکن آنکھ نے
لکھّا خبر خبر مجھے اخبار کر دیا

کل بھی تو ہم تھے کوئی ہمیں پوچھتا نہ تھا
کچھ لغزشوں نے کارواں سالار کر دیا



جب تری بندگی نہیں ہوتی
زندگی زندگی نہیں ہوتی

مطلعِ دل پہ ہو طلوعِ سحر
شب کو بھی تیرگی نہیں ہوتی

سُوکھ جاتا ہے گُلستانِ حیات
شاخِ دل جب ہری نہیں ہوتی

ہے توہّم فقط تخیّل کا
کوئی صُورت بُری نہیں ہوتی

حُسنِ اظہار کا ہے سارا کمال
بات کوئی نئی نہیں ہوتی

ہو ارادہ تو منزلیں آسان
راستوں کی کمی نہیں ہوتی

یادِ ماضی کبھی غمِ فردا
بزمِ دل، کب سجی نہیں ہوتی

حُسنِ ظن ہے نظر کا سب ورنہ
حُسن میں دل کشی نہیں ہوتی

جھوم اُٹھّے نہ جس سے سارا وجود
وہم ہے وہ خوشی نہیں ہوتی



آنسوؤں کو مُسکرانا چاہیئے
یہ ہُنر بھی آزمانا چاہیئے

دستکیں دینا مری عادت نہیں
وحشتِ دل کو ٹھکانا چاہیئے

اُڑ رہی ہے دُھول سارے شہر میں
اپنے چہروں کو چھپانا چاہیئے

میں سمجھتا ہوں مزارِ زیست پر
اِک نیا کتبہ لگانا چاہیئے

مبتلا ہیں سب بھیانک خواب میں
سونے والوں کو جگانا چاہیئے

دریافت

مَیں جاگتا ہوں کہ سو رہا ہوں
مَیں ہنس رہا ہوں کہ رَو رہا ہوں
مَیں مر رہا ہوں کہ جی رہا ہوں

مجھے تو کچھ بھی خبر نہیں ہے
مجھے تو کچھ بھی خبر نہیں ہے

مگر یہ کچھ کم خبر نہیں ہے
مگر یہ کچھ کم خبر نہیں ہے



ہو دل اُداس چمن میں بہار کیسے ہو
زمیں کو چین فلک کو قرار کیسے ہو

سحر کی آس میں شب کٹ گئی اُمیدوں کی
سحر کے بعد مگر انتظار کیسے ہو

ہیں یاد پیار کی سب لذّتیں مجھے لیکن
مجالِ خُونِ جگر بار بار کیسے ہو

تمام عُمر خزاں کی عبادتوں میں کٹی
ہماری سمت نگاہِ بہار کیسے ہو

تم ہی نے مجھ کو دلایا تھا کچھ یقینِ حیات
تم ہی چلے ہو تو اب اعتبار کیسے ہو



جہان زیر و زبر ہے عجیب عالم ہے
کسی کو کوئی خبر ہے عجیب عالم ہے
خُدا کی طرح وہ ہر سمت کیسے پھیل گیا
جدھر بھی دیکھو ادھر ہے عجیب عالم ہے
جو تیرا گھر تھا جہاں صرف تو ہی رہتا تھا
وہ عام راہ گذر ہے عجیب عالم ہے
یہ کس کا سحر ہے اِک ساتھ مطلعِ دِل پر
نمُودِ شام و سحر ہے عجیب عالم ہے
ہے آج تخت اُلٹنے کو کشورِ جاں کا
نہ بس میں دل نہ جگر ہے عجیب عالم ہے



زندگی ہو کہ قضا ، آگے چل
آئی پیچھے سے صدا آگے چل

اَب کسی ہاتھ کی مت آس پہ بیٹھ
ہاتھ میں لے لے عصا آگے چل

دُھوپ ہی دھوپ ہے ہر سمت مگر
اُس کا دل نہ دُکھا آگے چل

یہ خلاؤں کا سفر ہے مت بھول
چل پڑا ہے تو سدا آگے چل

اور منظر بھی ابھی دیدنی ہیں
اور دل کو نہ جلا آگے چل

وہ بھی مجبُور ہو مجھ سا شاید
وقت کا کر نہ گِلہ آگے چل

سانس تیرا کبھی میرا اقبال
اُس سے مت پیار بڑھا آگے چل



دل میں سیلابِ بلا آنکھ میں وحشت چاہے
نِت نئے ارض و سما میری طبیعت چاہے

ذہن بے چارہ بہر رنگ دلائے تسکین
دل وہ کمبخت کِسی طور نہ راحت چاہے

جسم ہر آن پگھل جانے کی جانب مائل
اور اِحساس ہر اک لمحہ قیامت چاہے

دل ہی اب اشک بہائے کہ زمانے کیلئے
آنکھ ہنسنے کی ہنسانے کی اجازت چاہے

ہر کوئی اپنی غرض اپنی ضرورت کا اسیر
کون اب پیار کرے کون محبّت چاہے؟

ہم تو کوشاں ہیں کہ کوشش ہی رضا ہے تیری
ورنہ ہوتا ہے وہی جو تری رحمت چاہے



اے کاکُل و رُخسار مجھے سوچنا ہوگا
بن جاؤ نہ آزار مجھے سوچنا ہوگا

انسان ہوں سوچوں سے تہی رہ نہیں سکتا
اے جذبۂ سرشار مجھے سوچنا ہوگا

مانا کہ غنیمت ہیں کڑی دھوپ میں سائے
گر جائے نہ دیوار مجھے سوچنا ہوگا

اب اُن سے بچھڑ کر ترا مقصد ترا مطلب
اے ہستئ بیکار مجھے سوچنا ہوگا



کہی سدا مرے جذبات نے خُدا لگتی
خِرد کے شہر میں پھر ان کی بات کیا بنتی

یہی سوال اُبھرتا ہے دل میں رہ رہ کر
اگر جمال نہ ہوتا تو آنکھ کیا کرتی

مَیں ڈوب جاتا ہوں اک سوچ کے سمندر میں
ترے بغیر مری زیست کِس طرح کٹتی

کرم کرم ہے، نہیں سوچ کا یہاں کچھ کام
مَیں آکھڑا ہوا ساحل پہ بہہ گئی کشتی



تاریک مِری رات مِرے شام و سحر بھی
تُم رُوٹھ گئے ، روٹھ گئے شمس و قمر بھی

کیا کم ہے تری یاد میں تنہا نہیں رویا
روئے ہیں لپٹ کر مجھے دیوار بھی دَر بھی

جی چاہے تو اِک روز اُسے آ کے بسا دو
اِس شہر میں موجود ہے اُجڑا ہوا گھر بھی

اِک میں ہی نہیں ! اس کی تو تاریخ ہے شاہد
پرواز کی خواہش نہ ہو، چھِن جاتے ہیں پر بھی



اس کو ہرگز نہ زندگی کہنا
ہم سے قدرت کی دل لگی کہنا

چاند سورج بُتانِ وہم وگماں
اُس کے پرتو کو روشنی کہنا

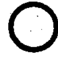
کارِ شاعر غبارِ جذبِ جنوں
اُس کے پیکر کو شاعری کہنا

حُسنِ فطرت ہزار اترائے
میرے جذبوں کی گدگدی کہنا

اُس کی یادیں بھی اتنی شیریں ہیں
چاندنی کو بھی چاند ہی کہنا



رات کا دن پر مجھے دھوکا ہوا
جاگنے کا وقت تھا سویا رہا
دیکھ لو یک دم زمیں شق ہو گئی
اپنے پاؤں پر تھا میں اچّھا رہا
زندگی کیا حال تیرا پوچھتا
میں تو اپنے حال میں اُلجھا رہا
اِس توقع پہ کہ پُورا خواب ہو
آنکھ کھُلنے پر بھی میں سویا رہا
زندگی کا چاہیئے کوئی ثبوت
کون مانے گا کہ میں زندہ رہا



جو سچ پُوچھو کسی سے پیار کب ہے
مری چاہت ابھی بیدار کب ہے

مجھے رونے کی عادت ہو گئی ہے
محبّت دوستو آزار کب ہے

مثالِ سائباں جلتے سروں پر
زمیں پر آسماں بیکار کب ہے

وہی برسوں کی صدیوں کی کہانی
فقط یہ آج کا اخبار کب ہے



بھلانے تم کو چلا تھا لیکن قدم قدم پہ یہ حادثہ تھا
تمہاری یادوں کا برِّ اعظم تمہاری باتوں کا منطقہ تھا

کتابِ ہستی لگا تھا پڑھنے کہ تم کو بھولوں کہ تم سے چھوٹوں
ورق ورق پر جدھر بھی دیکھا تمہارا احوال ہی لکھا تھا



ذہن تھا مطمئن نہ دل کی خوشی
ہم پشیماں تھے جیت کر بازی

مَیں نے راحت کے نام پر برسوں
رنج و آلام کی ستائش کی

صرف اُس شے کو معتبر جانا
جس کی دل نے مرے گواہی دی

ہم کو دیکھو، کہ رہ گئے پیچھے
وقت کے ساتھ ساتھ چل کر بھی

ہم کو دُنیا کے ساتھ چلنا تھا
دل لگی وقت کی ضرُورت تھی



مجھ کو حرفِ غلط لکھے کوئی
بات ہو ایک سو کرے کوئی

نیند اُس کی ہو خواب اُس کے ہوں
رت جگے مجھ کو سونپ دے کوئی

ہاتھ میرے ہوں لے کوئی نکلے
پاؤں میرے ہوں اور چلے کوئی

حالِ دل پوچھے کس کو فرصت ہے
پُوچھ بھی لے تو کیا کہے کوئی

کچھ تو ٹوٹے فسردگی کا فسوں
سازِ غمگیں ہی چھیڑ دے کوئی

موسمِ گُل میں بن کے بادِ نسیم
میرے آنگن میں چل پڑے کوئی

میں نے رو رو کے اُس کو لکھوایا
میری قسمت پہ کیوں ہنسے کوئی

غروب سے پہلے

اس سے پہلے کہ درد کے بادل
مطلعِ دل پہ آ کے رُک جائیں
تیرگیِ آرزو کے چہرے پر
اپنی بدبختیاں رقم کر دے
نا اُمیدی، اُمّید کہلائے
بے بسی دست و پا نگل پائے
آ کہ کچھ دیر کے لئے ہی سہی
چاند تاروں سے جھولیاں بھر لیں
زندگی پیار سے امر کر لیں
جو بھی ہونا ہے پھر وہی ہو جائے
میں کہیں اور تو کہیں کھو جائے



دیکھا مری طرف تو خُدا سوچنے لگا
جُرمِ وفا کی کیا ہو سزا، سوچنے لگا

دلکش نقوش آنکھ کا آزار بن گئے
جب سے مِرا دماغ ذرا سوچنے لگا

سوچوں نے میرے ذہن کے در بند کر دیئے
جب کوئی بات تیرے سِوا سوچنے لگا

اے دلفریب ساعتو! میری خطا مُعاف
فرمانِ ماہ و سال بِلا سوچنے لگا

بیادِ کیٹس

جبینِ وقت پر اپنے لہو سے
کسی خوشبو نے اِک مصرع لکھا تھا
"صداقت حُسن ہے حُسن اِک صداقت"
یہی مصرع مری رُوحِ غزل ہے
مری سوچوں کا دستورِ عمل ہے



قطعہ

مرے ہونٹوں پہ پھیلا ہے تبسّم
میں شاید آج رونا چاہتا ہوں
اُجالوں سے محبّت ہو رہی ہے
میں تاریکی میں کھونا چاہتا ہوں



بے خبری کی اِک جنّت تھی اُس کا پیار
سوتے رہنے کی مہلت تھی اُس کا پیار

سارا زمانہ ایک طرف اور میں تنہا
سیلِ حوادث کی قوّت تھی اُس کا پیار

قلب و نظر دونوں کے دونوں عاجز تھے
ایک جنوں تھا اِک حیرت تھی اُس کا پیار

کتنا مفلس ہے دل ، کتنی جاں قلاش
ایک خزانہ اک دولت تھی اُس کا پیار

درد بھی دل کو اپنا اپنا لگتا تھا
ایک انوکھی سی راحت تھی اُس کا پیار

وقت کے چُنگل سے باہر تھا میں اقبالؔ
من کی مرضی کی ساعت تھی اُس کا پیار



یہی سحر ہے ! کسے خبر ہے
نظر نظر ہے کسے خبر ہے

یہ جس میں برسوں سے بس رہا ہوں
مرا ہی گھر ہے کسے خبر ہے

کہوں تو شاید وہ مان جائے
مزاج پر ہے کسے خبر ہے

ہر ایک در ہے اب ایک جیسا
یہ اُس کا دَر ہے ! کسے خبر ہے

خنک فضا ہو کہ جلتا سُورج
سفر سفر ہے کسے خبر ہے

دل قوی جان ہیں کیسے کیسے
تیرے انسان ہیں کیسے کیسے

ہنسنے رونے کا سبب پُوچھتے ہیں
لوگ نادان ہیں کیسے کیسے

سوچتا ہوں تو ہنسی آتی ہے
اب بھی ارمان ہیں کیسے کیسے

دھیان آئے تو تخیّل مہکے
پھُول انسان ہیں کیسے کیسے

دم بخود ہے مری ہمّت طاقت
دل کے فرمان ہیں کیسے کیسے

وصل ، اُمّید ، مُسرّت ، چاہت
غم کے عنوان ہیں کیسے کیسے

کوئی پُوچھے گا نہ تبلائے گا
شہر ویران ہیں کیسے کیسے



کب کھلی ساعتِ دیدار مجھے یاد نہیں
کب مِلا زیست سے اِک بار مجھے یاد نہیں

ایسا لگتا ہے کہ سُورج ہے ازل سے سر پر
کب گری ریت کی دیوار مجھے یاد نہیں

جب بھی رویا ہوں تو پونچھے ہیں خود اپنے آنسو
کوئی تھا میرا بھی غمخوار مجھے یاد نہیں

دل تو خوش خوش تھا مگر ذہن تھا سہما سہما
جیت تھی میری کہ تھی ہار مجھے یاد نہیں

زندگی رنگ تھی، خوشبو تھی، ترنّم تھی کبھی
کب ہوئی درپے آزار مجھے یاد نہیں



غُربت بھوکے پیٹ کھڑی ہے
ساری دُنیا دیکھ رہی ہے
لاکھ ہو ٹھنڈا میٹھا پانی
چُھونے سے کب پیاس بُجھی ہے
کتنے سپنے روک رہے ہیں!
جاں کو مگر جانے کی پڑی ہے
راکھ میں تنکے ڈھونڈنے والو!
آگ تو گُلشن پھونک چکی ہے
جھونپڑیوں کے ہاتھ میں پتّھر
ایوانوں کی جاں پہ بنی ہے

نوحہ

پیار کیا تھا کہ پوجا تھی لیکن سدا
وہ بھی چُپ چُپ رہا میں بھی چُپ چُپ رہا
دیدہ و دل نے آپس میں سب کچھ کہا اور سب کچھ سُنا
پر زباں کچھ بھی کہنے پہ قادر نہ تھی
ہر سہارا تھا مجبُور معذور سا
حرف سارے کے سارے پشیمان سے
رنگ بے جان سے
سُر پریشان سے
وقت کب تک بھلا صبر سے دیکھتا
اُس نے برسوں کو صدیوں کو آواز دی
وہ کہ بھوکے تھے شاید کئی روز سے
ہم کو دیکھا تو یک لخت خوش ہو گئے
اور پھر سوچیے میں کہاں وہ کہاں



ہر صبح کبھی وعدۂ اُلفت کی طرح تھی
ہر شام حسینوں سے محبّت کی طرح تھی

مصروف شب و روز تھا لیکن زہے قسمت
اِک یاد تری لمحۂ فرصت کی طرح تھی

میں شہر میں بدنام تھا تُو دہر میں بدنام
ہستی! تری حالت مری حالت کی طرح تھی

میں کیسے کہوں دوستو کیا شے تھی جوانی
دم توڑتے انسان کی ہمّت کی طرح تھی

سائے میں سبھی ساتھ تھے پر دھوپ میں تنہا
دیوار کی قسمت مری قسمت کی طرح تھی

وہ پاس تو تھا پھر بھی مرے پاس نہیں تھا
اِک وصل کی شب بھی شبِ فُرقت کی طرح تھی



تُو اور میرے گھر آئے تو پھر گیت غزل کیا
دل رقص کرے گائے تو پھر گیت غزل کیا

ٹوٹا ہوا دل ہو تو چمک اُٹھتا ہے ہر فن
جب زخم ہی بھر جائے تو پھر گیت غزل کیا

گانے لگیں ملہار ہر اک سمت فضائیں
آنچل ترا لہرائے تو پھر گیت غزل کیا

بہتے نہیں جب اشک تو بن جاتے ہیں اشعار
جب آنکھ ہی بھر آئے تو پھر گیت غزل کیا

اِک آس کے بل بوتے پہ روشن دلِ فنکار
یہ چاند ہی ڈھل جائے تو پھر گیت غزل کیا

پس منظر

کیا عجب تماشا ہو
تم کہو مجھے اپنا
اور پاس پاس آؤ
پیار سے محبّت سے اپنی بانہیں پھیلاؤ
میں کہوں کہ اب جاؤ
میں کہ کل تمہارا تھا
آج ...... جانے دو چھوڑو
اور یاس و حسرت سے
اِک نظر مجھے دیکھو
اور پھر چلی جاؤ
میں تمہارے جانے پر
پھُوٹ پھُوٹ کر روؤں
کیا عجب تماشا ہو



وفا و مہر کا انعام بے وفائی ہے
یہ اور بات کہ دل کو وفا ہی بھائی ہے

ذرا بھی غم نہیں راہوں کے بھول جانے کا
کہ منزلوں کا مقدّر بھی جگ ہنسائی ہے

اُسے کہو کہ کبھی میرے گھر کا رُخ نہ کرے
عذاب لائی ہے جب بھی بہار آئی ہے

چلو چلیں اُسی در پہ کہ جس سے لوٹ آئے
یہی ہے دل کی تمنّا تو کیا بُرائی ہے

شکستہ خواب لئے میں نظر نظر گھوما
ہر ایک خواب کی تقدیر نارسائی ہے

میں زندگی کو سنبھالے پھروں بھلا کب تک
ہے پاس میرے مگر چیز تو پرائی ہے



کانپ اُٹھتا ہے دل گھوم کر شہر میں
لوگ جیتے ہیں کس آس پر شہر میں

رائیگاں سب کا سب حُسنِ شام و سحر
آنکھ نایاب ہے بے بصر شہر میں

دل بھی چھوٹا ہوا آنکھ بھی گھٹ گئی
آدمی ہو گیا مختصر شہر میں

چھوڑ کر حُسنِ فطرت کی آغوش کو
گاؤں پھرتا ہے اب در بدر شہر میں

میں نے دیکھا نہ تھا پیچھے مُڑ کر کبھی
پھر بھی پتھرا گیا سحر گر شہر میں

شہرِ وحشت سہی چھوڑ دوں کس طرح
تُو مری زندگی تیرا گھر شہر میں



بہاریں گدگداتی کیوں نہیں ہیں
خزائیں اب رُلاتی کیوں نہیں ہیں
حسیں شکلوں کو یہ کیا ہوگیا ہے
ستم اب دل پہ ڈھاتی کیوں نہیں ہیں
اَدائیں دلبرانہ تو ہیں لیکن
یہ اب بے خود بناتی کیوں نہیں ہیں
وفائیں موجبِ راحت نہیں کیوں
جفائیں دل جلاتی کیوں نہیں ہیں
ہیں لب بستہ یہ ساری بستیاں کیوں
کوئی قِصّہ سُناتی کیوں نہیں ہیں



زندگی اس کی وفا ہی نہیں کچھ اور بھی ہے
سوچ دیکھو تو کبھی سوچنے والوں کی طرح

شامِ فراق

اِک میں تھا اور تنہائی تھی
ہم دونوں خوش خوش رہتے تھے

تُم آئے میری دُنیا میں
تنہائی کو میں بھُول گیا

تُم چلے گئے تمہیں جانا تھا
تنہائی مجھ سے رُوٹھ گئی

اَب میں ہوں اور بس میں ہی ہوں
مرتا بھی نہیں جیتا بھی نہیں



گئے دن کہ تھی اِک زمانے کی فُرصت
ماہ و سال صدیاں لٹانے کی فُرصت

اندھیرا تو اب اور بڑھتا رہے گا
کسے اب ہے مشعل جلانے کی فرصت

اگرچہ بہت اب بھی دل چاہتا ہے
مگر اب کہاں دل لگانے کی فُرصت

منانے سے ممکن ہے وہ مان جائے
میں لاؤں کہاں سے منانے کی فُرصت

وہ دن بھی تھے بادِ سحر کو تھی حاصل
فسردہ گلوں کو ہنسانے کی فُرصت

بڑے بخت والے ہیں وہ لوگ جن کو
مُیسّر ہے آنسو بہانے کی فُرصت



مجھے زندگانی سے کام ہیں تجھے زندگی نہیں چاہیئے
مجھے اے خیالِ پری وشاں! تری دوستی نہیں چاہیئے

کوئی ماہ ہے تو ہُوا کرے کوئی مہر ہے تو ہُوا کرے
مجھے اپنی روشنی ہے بہت، مجھے روشنی نہیں چاہیئے

مرے ساتھ ہے ترا دل اگر مجھے بڑھ کے اپنے گلے لگا
مجھے چاہتوں کی تلاش ہے مجھے دل لگی نہیں چاہیئے

ہے یہی وفا تو عزیزِ من! اسے پاس رکھ اسے پاس رکھ
مجھے بے بسی نہیں چاہیئے مجھے بے کلی نہیں چاہیئے

تری بات وجہِ سکوں سہی تری ذات راحتِ جاں سہی
مجھے زندگی بھی عزیز ہے مجھے پیار ہی نہیں چاہیئے



چھت ہے باقی نہ در نہ دیواریں
یہ بھی کیا کم کہ گھر کا نام تو ہے



تری حکایت ترا فسانہ
وہ کیا ہوا دلنشیں زمانہ
میں اپنی آنکھوں سے دیکھ لوں کچھ
یہ چاند، سورج ذرا بجھانا
اگر ہے مقصد تلاشِ منزل
کبھی نہ دامِ یقیں میں آنا
میں جانتا ہوں خوشی کا مطلب
مجھے نہ اے زندگی بنانا!
میں بن تو لوں اے مرے مصوّر
بڑی خوشی سے مجھے مٹانا
طویل شب میں سحر کی باتیں
دلوں کی تسکین کا بہانہ



اِسی جہاں میں محشر بپا ہو ہم تم ہوں
جزا سزا کے خداؤ! کبھی تو ایسا ہو



نظر کے سامنے ہے ہو رہا ہے
نہیں کچھ جانتا کوئی کہ کیا ہے

میں اِک مُدّت سے بیدار سو رہا ہوں
مری آنکھوں میں کوئی جاگتا ہے

کسی کے جبر کو تسکیں کی خاطر
اَنا کہتی ہے میرا فیصلہ ہے

خبر طُوفاں کو کیسے ہو گئی ہے
ابھی تو شہرِ دل بسنے لگا ہے

ہے اُس سے پیار اپنے دل کی خاطر
ہمیں معلوم ہے وہ بے وفا ہے

سبھی سوچیں غموں نے ہضم کر لیں
ہمارے سوچنے کو کیا بچا ہے

صدی ہے بیسویں اور جی رہے ہیں
ہماری زندگی اِک مُعجزہ ہے



راہ بھی مجھ سے گریزاں مری منزل کی طرح
جانے کس بحر پہ اِستادہ ہوں ساحل کی طرح

میں کوئی خواب کوئی آس تراشوں کیسے
ذہن بھی زیست سے بیزار ہے اب دل کی طرح

میں سمجھنے سے ہوں قاصر تجھے اے جانِ غزل
عُمر بھر اپنی تگ و تاز کے حاصل کی طرح

مَیں کسے اپنا کہوں اور کسے بے گانہ
شہر کا شہر نظر آئے جو قاتل کی طرح

سخت نادم ہے مسیحا! یہ مرا دستِ سوال
تیری مشکل بھی ہے مشکل مری مشکل کی طرح



تمہارا لمس نویدِ حیات تازہ بنے
وفا بدوش ہواؤ کبھی تو ایسا ہو



وہ ایک جھوٹ سہی اعتبار کتنا تھا
دل و نظر کو میسّر قرار کتنا تھا

یہ بات طے ہے کہ میری خطا ہے پر مولیٰ
ترے جہاں میں مجھے اختیار کتنا تھا

سحر جو آئی تو کچھ اور بڑھ گئے سائے
تمام رات مگر انتظار کتنا تھا

مری وفا کی عطا تھی کہ تیرے حُسن کا فیض
مزاجِ شام و سحر خوشگوار کتنا تھا

یہ اور بات کہ بے بس ہو تو بھی میری طرح
مجھے خبر ہے! تجھے مجھ سے پیار کتنا تھا

نصیب سُکھ جو نہیں تھا بہت سے غم بھی نہ تھے
سکون ذہن کو پروردگار کتنا تھا



اب تو ہی بتا دے تجھے کیا کہہ کے پُکاروں
تو یاد ہے اور نام ترا بھول گیا ہوں